"میری علمی و مطالعاتی زندگی"

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی



ناشر

سید احمد شہید اکیڈمی

کتاب سے پہلے

۱۹۴۵ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ترجمان ''الندوہ'' نے برصغیر کے مشاہیر اہل علم و دانش کو دعوت دی تھی کہ وہ طلبہ اور اہل ذوق کے لئے ان کتابوں کی نشاندہی کریں جنہوں نے ان کی سوچ اور اخلاق و کردار کی تعمیر میں حصہ لیا، مولانا علی میاں صاحب نے بھی (جب ان کی عمر ۳۲ ربرس تھی) اپنے تأثرات و تجرباب قلم بند کیے، یہ مضمون، دوسرے مضامین کے ساتھ مولانا محمد عمران خان نے ''مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں'' (اعظم گڈھ: مطبع معارف، س-ن) میں شامل کرلیا تھا، بعدازاں ۱۹۷۲ء میں ماہنامہ ''الحق'' (اکوڑہ خٹک) کے مدیر کی فرمائش پر مولانا علی میاں نے ۱۹۴۵ء میں لکھے گئے مضمون پر نظر ثانی کی، اور اس میں جابجا اضافے کیے، تاہم جن کتابوں کا تذکرہ پہلی بار کیا گیا تھا، کم و بیش وہی رہیں، بعد میں انہوں نے اپنی علمی و تصنیفی اور تدریسی زندگی میں بلاشبہ سیکڑوں کتابوں کا مطالعہ کیا جن پر تبصرہ کیا جانا مشکل تھا، مضمون پر نظر ثانی کرتے ہوئے مولانا علی میاں نے بجا طور پر لکھا تھا: ''اس کا طرز واقعاتی اور سوانحی ہے، تنقیدی اور تحقیقی نہیں، اس لیے ذہن پر مطالعہ کے جو اثرات پڑے، ان کو بے تکلفی اور بے ساختگی کے ساتھ بیان کردیا ہے۔ مصنفین کے خیالات، مسلک اور طرزِ فکر کی پوری ذمہ داری نہیں لی گئی، اور نہ کسی ایسی کتاب اور مصنف کا ذکر محض اس کے مفید یا بلند پایہ ہونے کی وجہ سے کیا گیا ہے جس کے مطالعہ

کی نوبت نہیں آئی، یا ذہن وشعور نے اس سے کوئی گہرا اور دیر پا تأثر قبول نہیں کیا، اس لیے اس فہرست میں سے کسی کتاب یا مصنف کے نظر انداز ہو جانے کے معنی اس کی عدم افادیت یا تنقیص نہیں ہے۔"

مولانا نے نظر ثانی کرتے ہوئے جو چند حواشی لکھے تھے، وہ ان کے نام کے اظہار کے ساتھ، باقی حواشی سے الگ کر دیے گئے ہیں۔

سفیر اختر

عرض ناشر

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کو اللہ تعالیٰ نے جو مقبولیت عطا فرمائی، قریبی دور میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے، ان کی زندگی کے مختلف گوشوں پر سمیناروں کا سلسلہ ان کی وفات کے بعد کئی سال جاری رہا، مشہور رسالوں اور مجلات نے خصوصی اشاعتیں پیش کیں، عربی اور اردو میں ان کے خدمات اور فکر و خدمات پر کتابوں کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد یونیورسٹی کی جانت سے ایک یادگاری مجلّہ شائع کیا گیا تھا، جو اپنی بہت سی خصوصیتوں کی وجہ سے ممتاز ہے، مجلّہ کے مرتب جناب سفیر اختر صاحب نے حضرت مولاناؒ کے دو اہم مضامین جو مولانا کی علمی و مطالعاتی زندگی سے متعلق تھے "میری علمی و مطالعاتی زندگی" کے عنوان سے مجلّہ کے شروع میں شامل کئے ہیں، موضوع کے لحاظ سے یہ بہت اہم اور مفید مضمون ہے اس لئے اس کو مستقل کتابچہ کی شکل میں پیش کیا جارہا ہے، امید ہے کہ اس سے علم سے تعلق رکھنے والے خاص طور سے فائدہ اٹھائیں گے، اللہ تعالیٰ اس کے نفع کو عام کرے، اور اس کی اشاعت و تربیت میں حصہ لینے والوں کو اجر عطا فرمائے۔

بلال عبدالحی حسنی ندوی

دار عرفات، رائے بریلی

۲۰ رجمادی الثانی ۱۴۲۵ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

میری علمی و مطالعاتی زندگی

خاکسار کا خاندان ایک خزاں رسیدہ دینی خانوادہ ہے[۲] جس کے بزرگوں نے کبھی فصلِ خزاں میں بھی دنیا کو پیامِ بہار سنایا تھا، ہندوستان میں جب دین کی بہار آخر ہوئی تو اس خاندان پر بھی تنزل آیا، ہوش کی آنکھیں کھولیں تو دین داری جوانوں سے زیادہ بوڑھوں میں، اور مردوں سے زیادہ عورتوں میں تھی۔

میرے والد مرحوم مولانا حکیم سید عبدالحی نے ۱۹۲۳ء کے شروع میں انتقال کیا، میری عمر اس وقت دس سال کی تھی، میرے بڑے بھائی صاحب ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبدالعلی صاحب لکھنؤ میں میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے، اور میں اپنے وطن رائے بریلی میں اپنی والدہ صاحبہ کے ساتھ رہتا تھا، اور بھائی صاحب کی ہدایت کے مطابق خاندان کے بعض بزرگوں سے فارسی کتابیں پڑھتا تھا، اور لکھنؤ بھائی صاحب کے پاس آتا جاتا رہتا تھا۔

خاندان میں دستور تھا کہ تقریباً روزانہ اور ان دنوں میں خاص طور پر جب کسی حادثہ کی وجہ سے تسکین و مشغلہ کی ضرورت ہوتی، ایک گھر کی تمام بیبیاں ایک جگہ جمع ہو جاتیں، اور ہمارے ہی خاندان کے ایک بزرگ (سید عبدالرزاق صاحب کلامی، م ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء) کی منظوم ''فتوح الشام''[۳] پڑھی جاتی۔

سید عبدالرزاق صاحب کلامی مرحوم، حضرت سید احمد شہید کے ہمشیرزادہ منشی سید حمید الدین صاحب کے پوتے اور ان کے حقیقی بھائی سید عبدالرحمٰن صاحب کے نواسے تھے۔ واقدی کی عربی ''فتوح الشام'' کو کلامی صاحب نے بڑی قادر الکلامی اور جوش و دلی جذبہ کے ساتھ پچیس ہزار شعروں میں اردو میں نظم کیا ہے، چونکہ ان کو اس کا طبعی ذوق تھا، اور جہاد و حرارتِ ایمانی کی چنگاری اسی تنور سے منتقل ہوئی تھی جس نے ایک وقت میں سارے ہندوستان کو گرما دیا تھا، اس لیے نظم میں جوش و اثر اور کلام میں آمد ہے۔ حضرت خالدؓ سے شاعر کو عشق تھا، اور خواب میں بار بار ان کی زیارتیں ہوئی تھیں، اس لیے خصوصیت کے ساتھ ان کا ذکر کرتے ہوئے وہ بے قابو ہو جاتے ہیں، اور اشعار میں خاص روح اور زور پیدا ہو جاتا ہے۔ میری بڑی خالہ سیدہ صالحہ مرحومہ جو قرآن مجید

کی بھی حافظہ تھیں، یہ منظوم ''فتوح الشام'' بڑے پر اثر و دلکش لہجہ میں پڑھتی تھیں، اور پڑھتے پڑھتے کتاب ان کو بہت رواں ہو گئی تھی۔ عموماً عصر کے بعد یہ مجلس ہوتی، بچے بھی کبھی اپنی ماؤں کے پاس کھیلتے کھیلتے یا کسی پیغام کے لیے آجاتے، اور بے ارادہ کچھ دیر ٹھہر کر سنتے، کبھی بارادہ بیٹھ جاتے، اور کبھی مائیں اپنے پاس بٹھا کر سننے کا موقعہ دیتیں، پھر جب اس میں لطف آنے لگتا تو کھیل چھوڑ کر اس مجلس میں شریک ہوتے۔

میری خالہ مرحومہ جب سادہ و بے تکلف، لیکن پر اثر لہجہ میں یہ اشعار پڑھتیں، تو جہاد کا ایک سماں بندھ جاتا، دل امنڈ آتے، حضرت خالدؓ، حضرت ضرارؓ اور ان کی بہن حضرت خولہؓ بنت الازور اور دوسرے صحابہ کرامؓ و مجاہدین شام کی جاں بازی اور شجاعت کا ذکر آتا تو مجلس پر ایک کیف و سرور اور نشہ سا طاری ہو جاتا، کسی سخت معرکہ میں مسلمانوں کے گھر جانے اور کسی بہادر کے شہید ہونے کا تذکرہ ہوتا تو آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتیں، آنسوؤں کے یہ طوفان اٹھتے اور برستے تو ان کا چھینٹا ہمارے معصوم دلوں پر بھی پڑ جاتا، اور اس نرم مٹی کو تر کر جاتا۔ ''فتوح الشام'' کی ان زندہ مجلسوں نے دل پر یہ اثر چھوڑا کہ مجاہدین کی محبت و عظمت اور اللہ کی راہ میں جان دینے کی قیمت کو کوئی نئی علمی تحقیق، اور جہاد کو مدافعانہ ثابت کرنے کی کوئی کوشش کم نہیں کر سکی۔ خون کے نقش کو سیاہی کے وہ نقوش کبھی نہیں مٹا سکتے جو لیٹے لیٹے یا آرام سے بیٹھے بیٹھے کاغذ پر ثبت کیے جائیں، پھر وہ نقش جس کو بچپن کے پاک آنسوؤں نے پائیداری بخشی ہو۔

اتانی ھواھا قبل ان اعرف الھویٰ

فصادف قلباً خالیاً فتمکنا

دوسرا اثر یہ ہوا کہ اس قوم و مذہب (عیسائیوں) کے خلاف جس کے مقدر میں قیامت تک کے لیے اسلام کا عالم گیر حریف و مد مقابل بننا لکھ دیا گیا ہے، اور جس کی قائم مقامی اور وراثت موجودہ یورپ کے حصہ میں آئی ہے، ایک حریفانہ جذبہ اور عناد پیدا ہو گیا جس پر کسی ملک کے مقامی مسائل و حالات کبھی غالب نہیں آسکے۔

اس وقت شرفاء کے خاندانوں میں ''مسدسِ حالی'' کا عام رواج تھا۔ اس کے اشعار لوگوں کے نوکِ زبان تھے، تقریروں اور مواعظ میں جابجا اس کے اشعار سے کام لیا جاتا، مضامین میں نقل کیے جاتے۔ میں نے بھی ''مسدس'' کو بڑے جوش و لطف سے بار بار پڑھا، اس کے اشعار اپنی تقریروں میں جو بچوں کے جلسوں میں کی جاتیں، اور ان انعامی مضامین میں جو مقابلہ کے لیے لکھے جاتے، بار بار نقل کیے۔ اس کا بہت سا حصہ زبانی یاد تھا۔ دل و دماغ پر ''مسدس'' کا اچھا خاصا اثر رہ چکا ہے، عام استعداد و معلومات میں اضافہ کے علاوہ اس کا ایک احسان یہ تھا کہ برسوں بعد مغربی مورخین و مصنفین کی یہ کوشش بالکل بے اثر رہی کہ جاہلیت عرب کی اتنی مدح سرائی کی جائے اور اس میں اگر خوبی کے کچھ ذرات تھے تو ان کو خردبین سے دیکھ کر پہاڑ بنا کر اس طرح پیش کیا جائے کہ معلوم ہو کہ عربوں میں اخلاقی انقلاب کی پوری تیاری تھی، اور کوہ آتش فشاں پھٹنے کو تھا کہ موقع شناسی سے بروقت اس کو چنگاری دکھادی گئی۔ اسلامی انقلاب کی پیغمبرانہ عظمت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ کی اہمیت کو گھٹانے کی یہ علمی سازش مولانا حالی کے ان پُر اثر اور سادے چند بندوں پر غالب نہ آسکی جن میں انہوں نے جاہلیت کا نقشہ اور اس کی اخلاقی پستی کی تصویر کھینچی ہے۔ نہ بعض قوم پرست عربوں کے مضامین اور تالیفات متاثر کرسکیں جو اپنی قومیت کے جوش میں کبھی کبھی جاہلیت کی طرف سے مدافعت کرنے لگتے ہیں، اور اس کے روشن پہلو کے دکھانے میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔

میرے گھر کا ماحول دادا صاحب (مولوی سید فخر الدین صاحب خیالی) اور والد صاحب کی وجہ سے جو جید عالم اور عربی کے مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ اردو کے ادیب و نقاد بھی تھے، دینی کے ساتھ ادبی بھی تھا۔ بہت بچپن ہی سے اردو نثر و نظم کی درسی و غیر درسی کتابیں ہم بھائی بہنوں کے مطالعہ میں رہتی تھیں، مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد، راشد الخیری کی بہت سی کتابیں اس زمانہ میں پڑھ لیں، اس زمانہ میں عام طور پر مولوی اسماعیل صاحب میرٹھی کا اردو نصاب ''کمکِ اردو''، ''سوادِ اردو'' اور ''سفینۂ اردو'' رائج تھا۔ ہندوستان کا سررشتہ تعلیم ان کتابوں سے بہتر کتابیں مرتب نہیں

کرواسکا، ان میں ''سفینۂ اردو'' کا اثر آج تک دل و دماغ پر باقی ہے۔ تقریباً نصف صدی گزر جانے کے بعد، اور ذہنی بلوغ وارتقاء کی بہت سی منازل طے کر لینے کے باوجود اب بھی اگر وہ کتاب ہاتھ آجائے (جو افسوس ہے کہ اب بالکل نایاب ہے) تو شاید سب کام چھوڑ کر اُسی کو پڑھنے لگوں، اور بچپن کی یاد تازہ کروں، اور کم سے کم اپنی چند پسندیدہ نظمیں اور مضامین، مولوی ظفر علی خاں بی-اے علیگ کی نظم ''راجہ دسرت کی کہانی'' اور حیدرآباد کے طوفان پر ان کی نظم ''اونامراد ندی''، سید سجاد حیدر یلدرم کا مضمون ''مجھ کو میرے دوستوں سے بچاؤ'' کو ایک بار پڑھے بغیر [کتاب] ہاتھ سے رکھنی مشکل ہو جائے۔ اس غیر شعوری مطالعہ کا یہ فائدہ ہوا کہ زبان کا لطف اور ذوق زندگی کے ہر دور میں ساتھ رہا، اور تحریر وانشاء میں کبھی مولویانہ خشکی پیدا نہ ہونے پائی۔ میرے خیال میں ابتدائے عمر میں سلیس وشگفتہ زبان اور اچھے مصنفین کی کتابوں کا پڑھنا جو سلیس وشیریں زبان میں اپنے خیالات ادا کرنے کے عادی ہیں، بہت مفید اور ایک حد تک ضروری ہے، ورنہ نئی نسل اور نئے عہد سے رشتہ منقطع ہو جاتا ہے اور دعوت وتلقین کا پورا فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

اردو کے ابتدائی مطالعہ اور طالب علمی کے اس ابتدائی دور میں جس کتاب کو اپنے شوق سے پڑھا، اور جس نے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ قاضی سلیمان صاحب منصور پوری مرحوم کی سیرت ''رحمۃ للعالمین'' کا پہلا حصہ ہے، مجھے یہ کبھی نہیں بھولے گا کہ جب اس کی دونوں جلدوں کا بعض دوسری کتابوں کے ساتھ وی-پی رائے بریلی آیا ہے اور اس کے چھڑانے کے لیے اس وقت روپیہ نہ تھا، تو میں نے بے اختیار رونا شروع کیا، یہاں تک کہ کسی نہ کسی طرح اس کا انتظام کیا گیا اور کتاب میرے ہاتھ میں آئی، بار بار پڑھی، کئی جگہ اور کئی بار اپنے دل اور آنکھوں کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ بعض خاص مقامات کا ہمیشہ خاص اثر پڑتا تھا، اسلام کے ابتدائی مبلغین کے واقعات حضرت مصعبؓ بن عمیر کی مکی و مدنی زندگی کا مقابلہ، ان کی والہانہ کیفیت، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ طیبہ میں تشریف آوری اور حضرات انصار کی مسرت، استقبال اور جان نثاری، انصار کا ایثار اور مہاجرین کے ساتھ ان کی دینی محبت، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے واقعات وحالات کا دل پر

خاص اثر پڑتا تھا، ٹہل ٹہل کر ان کو پڑھتا تھا، لوگوں کو سناتا تھا اور اسی زندگی کی تمنائیں دل میں پیدا ہوتی تھیں۔ قاضی سلیمان صاحب کے درجات اللہ بلند فرمائے، اس عالم میں ہوتے تو کہتا کہ آپ کی کتاب کا مجھ پر بڑا احسان ہے، اس نے سب سے پہلے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے اس مزہ سے آشنا کیا جس کے بغیر یہ زندگی اور عالم خس وخاشاک ہے۔

در خرمن کائنات کردیم نگاہ

یک دانہ محبت است باقی ہمہ کاہ

انہی دنوں کے کچھ بعد میرے ہاتھ میں مولانا شبلی مرحوم کی ''الفاروق'' آ گئی۔ مطبع نامی۔ کانپور کی چھپی ہوئی، سراپا تصویر، پڑھی اور کئی بار پڑھی۔ عراق کی جنگوں بویب، جسر، قادسیہ وغیرہ کے میدان جنگ کی تصویر مولانا نے جن چھوٹے چھوٹے بے ساختہ و برجستہ جملوں میں کھینچی ہے، شاید اس سے زیادہ فردوسی ''شاہنامہ'' میں مسلسل اشعار اور پر شکوہ الفاظ اور مبالغہ سے پیدا نہیں کر سکا۔ ''الفاروق'' کے جاندار اور گرم جملے اور لفظ شمشیر وسناں کا کام کرتے ہیں۔ مولانا نے نظامِ خلافت پر جو کاوش کی ہے، اس کے سمجھنے کی اس وقت صلاحیت نہ تھی، اور اب اس سے کوئی دلچسپی اور علمی تاثر نہیں ہے، لیکن واقعات کے حصہ کا اثر اس وقت بھی تھا اور اب بھی ہے۔

مولانا کی دوسری کتاب جو اس دور میں پڑھی، ''سفرنامہ روم ومصر وشام'' تھی۔ اتفاق سے یہی دو کتابیں ہمارے گاؤں کے محدود ذخیرہ کتب میں تھیں۔ آخر الذکر کتاب سے معلومات میں بڑا اضافہ ہوا، ذہن میں وسعت پیدا ہوئی، اور کیا عجب ہے کہ اوّل اوّل اسی کتاب سے دنیائے اسلام کی سیاحت کا شوق پیدا ہوا ہو جس کی نوبت برسوں بعد آئی۔ کچھ عرصہ بعد مولانا کی سوانحی تصنیفات ''الغزالی''، ''سوانح مولانا روم'' اور ''المامون'' پڑھیں۔ غالباً اسی وقت سے ذہن نے یہ اثر قبول کیا کہ سوانح حیات اور تذکرہ نگاری کے لیے اس سے بہتر اسلوب اور زبان جدید اردو میں پائی نہیں جاتی، اور غیر ارادی طریقہ پر ان تذکروں اور ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کے سلسلہ میں جو راقم کے قلم سے نکلا، اس کو اختیار کیا گیا۔ افسوس ہے کہ ''شعر العجم'' کے پڑھنے کی نوبت بہت بعد

میں آئی جس کو میں اپنے موضوع پر منفرد اور مولانا کا شاہکار سمجھتا ہوں۔ اس تاخیر میں غالباً میری فارسی کی کم لیاقتی کو دخل تھا۔

عم محترم مولانا سید طلحہ صاحب حسنی مرحوم ایم۔اے، استاد اورینٹل کالج۔لاہور کی صحبت اور مجلسوں میں "آب حیات" سے تعارف ہوا، سنی اور بار بار پڑھی، یہاں تک کہ اس کے بہت سے مضامین مستحضر ہو گئے۔ اشخاص، شعراء اور ان کا کلام دماغ پر اس طرح نقش ہو گیا جس طرح بچپن کی دیکھی ہوئی چیزیں اور سنی ہوئی باتیں ذہن پر مرتسم ہو جاتی ہیں، اور ان کا دماغ پر کوئی بار نہیں ہوتا۔ "گل رعنا" گھر کی کتاب تھی، اس کو اتنی بار پڑھا کہ اردو شاعری کی تاریخ اور شعراء کے متعلق اتنی معلومات ہو گئی کہ اس موضوع پر مجلس میں گفتگو کرنے اور گفتگو میں حصہ لینے کی استعداد پیدا ہو گئی۔

میرے حقیقی ماموں زاد بھائی مولوی سید ابوالخیر صاحب برق لکھنؤ کی ٹکسالی زبان لکھتے اور بولتے تھے۔ لکھنؤ کے محاورات اور صحت و صفائی زبان میں وہ سند کا درجہ رکھتے تھے، سخن شناس بھی تھے اور سخن سنج بھی، ابتداء میں شمس لکھنوی کو کلام دکھاتے تھے، پھر آغا ثاقب قزلباش لکھنوی کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہو گئے اور انھیں کے رنگ کی پیروی کی، ان کی صحبت میں زبان کا ذوق، اور اچھے برے کی تمیز پیدا ہوئی۔ ان کے چھوٹے بھائی حافظ سید حبیب الرحمٰن جامعہ ملیہ میں پڑھتے تھے، ان کو اردو شعر و شاعری کا بڑا شوق تھا۔ ان کا ایک خاص ذوق یہ تھا کہ بچوں سے اساتذہ کے اشعار کا مطلب پوچھتے اور اردو میں تقریر و تحریر کے مقابلے کرواتے۔ اس سلسلہ میں خاص طور پر مومن، غالب، ذوق اور لکھنؤ کے شعراء میں سے آتش اور امیر مینائی کے کلام سے ان کو خاص ذوق تھا، چنانچہ ان کے اشعار سننے اور ان کا مطلب بیان کرنے کے سلسلہ میں دماغ پر زور ڈالنے، اور مشکل اشعار کے سمجھنے کی عادت پڑی۔ اس زمانہ میں اودھ میں مشاعروں کا بڑا زور تھا، ہمارے چھوٹے سے گاؤں میں کئی مشاعرے ہوئے، دیکھا دیکھی میں نے بھی کچھ موزوں کرنے کی کوشش کی، مگر اللہ تعالیٰ بڑے بھائی صاحب کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے بہت سختی سے روک دیا، اور یہ شغل

بے حاصل جاری نہ رہ سکا۔

رائے بریلی میں گھر میں بعض عزیزوں کا ذخیرۂ کتب تھا جس میں مولوی محمد حسین آزاد کی ''نیرنگ خیال'' بھی تھی، عمر کے اس ابتدائی دور اور زبان وادب کے اس ابتدائی ذوق میں آزاد کی نثر کا جو نثر اردو کا ایک مرصع نمونہ ہے، بہت اثر پڑا۔ بہت دنوں تک ''نیرنگ خیال'' اور ''آب حیات'' کی تقلید میں بہت سے صفحے سیاہ کیے، جو اپنی کم سوادی کے باوجود فائدہ سے خالی نہیں رہے، یہ زمانہ ہر چھپی ہوئی چیز کے پڑھنے کے مرض کا تھا، ہر قسم کی چیزیں پڑھیں، شرر مرحوم اور رتن ناتھ سرشار کی بھی چند کتابیں پڑھیں۔ کہتے ہیں کہ کوئی پڑھی ہوئی چیز خواہ بھلا دی جائے، بے کار و بے اثر نہیں رہتی، اپنا اچھا برا اثر ضرور کرتی ہے، اس لیے اس کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ نقش آنکھوں سے آگے نہیں بڑھنے پائے، لیکن ان کا کوئی خاص اثر یاد نہیں آتا۔

اردو مضمون نویسی میں ابتدائی اثر والد مرحوم کی کتاب ''یادِ ایام'' کا تھا، جو سنجیدہ زبان کا ایک شگفتہ نمونہ ہے، اور جس میں تاریخ کی متانت کے ساتھ، زبان کا بانکپن بھی موجود ہے جو میرے علم میں مصنف ''گلِ رعنا'' اور نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی تحریر کا مشترک جوہر ہے، اس طرز پر میرا مضمون جو اب یاد آتا ہے ''اندلس'' پر تھا۔

عربی تعلیم شروع ہو جانے کے بعد میرے استاد شیخ خلیل [عرب] بن محمد بن شیخ حسین یمنی (محدث بھوپال) نے ہمیشہ کے لیے دل پر توحید کا نقش قائم کر دینے کے لیے سورۂ زمر بڑی توجہ اور ذوق وشوق سے پڑھائی۔ عربی ادب، اور بالخصوص عربی شعر کا عرب صاحب مرحوم کو اللہ نے ایسا فطری ذوق بخشا تھا، جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ وہ اس قوم کے فرد تھے جس کے متعلق زبانِ نبوت نے شہادت دی ہے، کہ ایمان اس کے گھر کی دولت ہے (الایمان یمان)، عجم کا ''حسن طبیعت'' ننھیال سے اور عرب کا ''سوزِ دروں'' انہوں نے ددھیال سے پایا تھا۔ قرآن مجید پڑھتے تھے تو خود بھی روتے تھے، اور دوسروں کو بھی رلاتے تھے، قصائد پڑھتے تھے، تو سوق عکاظ کا نقشہ کھینچ دیتے تھے۔ توحید ان کا ذوقی مضمون تھا، دل کھول کر پڑھایا، اور دل کو توحید کے لیے کھول دیا، وہ

دن ہے اور آج کا دن، اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے۔ ''الا للہ الدین الخالص ''(سورہ زمر) کا نقش قائم ہے، اور اس کے سامنے ما نعبد ھم الا لیقربونا الی اللہ زلفا (زمر)، (مشرکین کہتے ہیں کہ ہم اپنے معبودوں کی عبادت محض اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا کے قریب کر دیں) کا حیلہ اور دعویٰ، جو ہمیشہ کے نظام شرک کا سب سے بڑا فلسفہ ہے، تارِ عنکبوت معلوم ہوتا ہے۔

ادب میں شیخ خلیل عرب کا ایک مجتہدانہ نصاب تھا، جو ہندوستان میں بالکل نیا تھا، ان کو اپنا ذوق تلامذہ کی طرف منتقل کرنے میں خاص کمال حاصل تھا، انہوں نے مبادئ صرف اور تحریر و انشاء کی مشق کے ساتھ مصر و بیروت کے سلسلہ قراءت (ریڈرس) المطالعۃ العربیہ، الطریقۃ المبتکرۃ (۱۵ اجزاء)، مدارج القراءۃ (ایک جزء) کے بعد ابن المقفع کی ''کلیلہ و دمنہ''، ''مجموعۃ من النظم و النثر'' حصہ نثر کا ایک حصہ حفظاً اور حصہ نظم، نہج البلاغہ حصہ کتب، اور نظم میں ''حماسہ''، اور معری کی ''سقط الزند''، اور ''دلائل الاعجاز للجرجانی'' بڑے ذوق و شوق سے، نیز ''مختصر تاریخ ادب اللغۃ العربیہ'' پڑھائی، عربی کے قواعد زبان کی مشق میں سب سے بڑا احسان اس گمنام کے نامور ہم نام ابوالحسن علی الضریر کے رسالہ ''الضریری'' کا ہے، جو چند اوراق کی کتاب ہے۔ عرب صاحب نے اس کی عملی مشق کرائی، اور یہی مشق اس وقت تک کام آ رہی ہے۔ اس تعلیم کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ایک وقت میں مختلف علوم و فنون اور زبانوں کی تعلیم نہ تھی، صرف عربی زبان و ادب کی تعلیم تھی اور وہی اوڑھنا بچھونا، وہی مقصدِ حیات اور وہی ذوق طبع۔

عرب صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اپنے محبوب و منتخب مصنفین اور ان کی محبوب و منتخب تصنیفات کو اس طرح طلبہ کے سامنے پیش کرتے تھے، گویا وہی زبان و ادب اور طرزِ ادا کا واحد نمونہ اور ادب و ذوق کا منتہٰی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہ مصنفین طلبہ کے دماغ اور تخیل پر حاوی ہو جاتے تھے، اور طالب علم ان کا رنگ اتارنے لگتے تھے۔ ابن المقفع اور جاحظ نثر میں، عبدالقاہر جرجانی ذوق، نقدِ ادب اور سخن فہمی میں، متنبی و بحتری شعر میں ان کے منتخب لوگ تھے، اس لیے ان کے طلبہ اپنی بڑی سعادت اور کمال سمجھتے تھے کہ ان میں ان کا رنگ اور انداز پیدا ہو جائے۔ راقم

الحروف نے ابن المقفع اور صاحب نہج البلاغہ، نیز کبھی کبھی جرجانی کی تقلید میں لکھنے کی کوشش کی اور اس کا بڑا فائدہ ہوا۔ عرب صاحب کا ایک تعلیمی نکتہ یہ بھی تھا کہ وہ طلبہ کے دماغ پر یہ نقش قائم کر دیتے تھے کہ ادب ونثر کا ترکہ صاحب ذوق طلبہ کی میراث ہے، جس کے استعمال کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے میں انہیں باک نہیں ہونی چاہیے، چنانچہ ان کی ہمت افزائی سے کبھی کبھی ان صاحب طرز انشاء پردازوں کے بعض بعض جملے اور تعبیریں اپنی تحریر میں نگینہ کی طرح جڑ کر انعام حاصل کیا۔

اس تعلیم کے انتہائی مرحلہ پر مصر کے مشہور صاحب طرز نثار سید مصطفیٰ لطفی المنفلوطی کی کتاب ''النظرات'' عرب صاحب نے دیکھنے کو دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس صدی کا یہ ساحر ادیب دماغ اور تخیل پر چھا گیا اور دل میں سما گیا، اس کے عنوانوں پر اپنے مضامین لکھے اور تیز رفتار رہوار کے پیچھے دوڑ کر دور تک خاک اڑائی۔

میری مکرر خوش قسمتی تھی کہ حدیث میں مولانا حیدر حسن خاں صاحب جیسا متبحر استاد نصیب ہوا، جو مولانا غلام احمد صاحب لاہوری، مولانا لطف اللہ صاحب کوئلی، مولانا احمد حسن صاحب کانپوری اور شیخ الاسلام شیخ حسین یمنی کے شاگرد، اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے مجاز تھے۔ یہ بھی خوش قسمتی تھی کہ حدیث کی تعلیم شروع ہوئی تو کوئی دوسرا فن اور موضوع مزاحم نہ تھا، صرف حدیث کے اسباق تھے، مولانا کی صحبت تھی، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ تھے، اور ندوۃ العلماء کا نادر علمی ذخیرہ اور مولانا کے علمی مآخذ تھے۔

مولانا کے یہاں تعلیم کی دوسری خصوصیتیں تھیں جن کی وجہ سے فن کا ذوق اور اس کا کچھ (بہ قدر استعداد و توفیق) عملی ملکہ حاصل ہو جایا کرتا تھا، ایک یہ کہ تعلیم بالکل ناقدانہ اور محدثانہ اصول پر تھی، مولانا کو مذہب حنفی پر کلیتہً اطمینان تھا، اور وہ اس کے زبردست وکیل وترجمان تھے، لیکن ان کا درس حدیث محدثانہ طرز اور نقد حدیث، اصول حدیث و رجال کی بحثوں پر مبنی تھا، اور اس میں ہندوستانی طرزِ تدریس حدیث سے زیادہ یمنی طرزِ حدیث، اور شوکانی کے طرزِ تالیف کا اثر تھا۔

شوکانی کی تالیف ''نیل الاوطار'' اس کا ایک نمونہ ہے۔ محدثین میں خصوصاً [محمد بن] ابراہیم الوزیر اور محمد بن اسمٰعیل الامیر، اور علامہ مقبلی کی تالیف، اور اصول حدیث کے بعض نوادران کے خاص مآخذ تھے، جن میں ''تنقیح الانظار'' اور ''توضیح الافکار'' کے قلمی متن وشرح کے مسودات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ دوسری چیزوں کے مقابلہ میں علامہ ابن الترکمانی کی ''الجوہر النقی''، امام زیلعیؒ کی ''نصب الرایہ'' سے بہت مدد لیتے تھے، اور حدیث صحیح کا جواب حدیث صحیح سے اور نقد حدیث کے مسلمہ اصول ومجتہدانہ مباحث سے دیتے تھے، دوسری چیز یہ کہ ان کا درس عملی تھا، جس میں طالب علم استاد کے ساتھ شریکِ عمل ہوتے تھے۔ مولانا طلبہ ہی سے کتابوں کے نقول، مذاہب کے دلائل، رجال پر نقد وجرح کی بحثیں نکلواتے تھے، اس طرح تدریس وتالیف کا سلیقہ سکھاتے تھے۔

درس حدیث میں عملی طور پر سب سے زیادہ فائدہ امام نوویؒ کی ''شرح مسلم'' سے ہوا، جو ایک مبتدی طالب علم کے لیے بڑا اچھا استاد ہے۔ شروحِ حدیث سے فائدہ اٹھانے اور ذہن پر زور ڈالنے کا ملکہ اسی سے پیدا ہوا، ''فتح الباری'' سے استفادہ کی اصل نوبت تدریس کے زمانہ میں آئی، اس وقت حافظ ابن حجر کی وسعت نظر، فن حدیث پر ان کی قدرت، اور اس کے وسیع ذخیرہ پر ان کا احتواء دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں۔ یہ کتاب مسلمانوں کا ایک علمی کارنامہ ہے جس کی نظیر سے دوسری ملتوں کا مذہبی ذخیرہ خالی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے کہیں وجد وسرور کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، قلبی طور پر سب سے زیادہ اثر ابوداؤد کی ''کتاب الادعیہ'' اور ترمذی کی ''کتاب الزہد والرقاق'' نے ڈالا۔

اسی زمانہ میں ''احیاء العلوم'' دیکھنے کا شوق ہوا اور اس نے دل پر بجلی کا سا اثر کیا، مگر یہ مطالعہ جاری نہیں رہ سکا۔ اس میں بڑے بھائی صاحب کی بصیرت کو دخل تھا جن کے نزدیک اس کے مطالعہ کے شغف سے بعض غیر معتدل رجحانات کے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔

۱۹۳۰ء میں شیخ خلیل عرب کی تجویز اور بھائی صاحب کی دعوت پر دار العلوم ندوۃ العلماء میں تدریسِ ادب کے لیے ایک فاضل ومحقق صاحبِ زبان مراکشی عالم تشریف لائے، یہ علامہ شیخ تقی

الدین ہلالی تھے، جن کو اگر نہ دیکھا ہوتا تو عربی زبان و ادب کے بہت سے مبادی و بدیہیات، زبان کی تعلیم کے بہت سے حقائق و اصول نظر سے ہمیشہ اوجھل رہتے، اور عجمیت و ہندیت کے اثر سے کلیتہً آزادی نصیب نہ ہوتی۔ ان کو اگر نہ دیکھا ہوتا، تو قرن ثانی و ثالث کی زبان کو مردہ اور صرف کاغذ کے نقش و نگار سمجھتے، اس ایک شخص میں سلف کی احتیاط اور علمی تورع (عدمِ تحقیق کی حالت میں بے تکلف لاادری کہہ دینا)، مغربِ اقصیٰ خصوصاً اہل شنقیط کا حفظ واستحضار، اہل لغت کا اتقان، علمائے نحو کی پختگی، اور اہل زبان کی شیریں نوائی اور خوش گفتاری جمع تھی، بات کرتے تھے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے، ہر جملہ ادب کی جان ہوتا تھا جس کو آدمی جس ادب کی کتاب کے حاشیہ پر چاہے لکھ لے، میں نے "اغانی" اور جاحظ کی کتابوں کی زبان بولتے ہوئے ان کے سوا کسی کو نہیں سنا، جو لکھتے تھے، وہی بولتے تھے، اور جو بولتے تھے وہی عربی زبان کا روزمرہ اور محاورہ ہے۔

ہلالی صاحب سے عربی ادب و شعر کی کتابیں پڑھنے کی بھی سعادت حاصل ہوئی، لیکن اس سے زیادہ مفید ان کی صحبت اور مجالس و سفر کی رفاقت تھی، ان کی صحبت وافادات سے دو حقیقتیں پہلی بار منکشف ہوئیں، ایک تو یہ کہ زبان اور ادب میں فرق ہے۔ زبان وہ ہے جو ادب کی بنیاد ہے، ادب زبان کی بنیاد کے کاخ وایوان اور زبان کی دیوار کے نقش و نگار ہیں، ادب خیالات کے اظہار کا بلند اور فنی اور ترقی یافتہ ذریعہ ہے، جو تمدن و تخیل کی ترقی سے پیدا ہوتا ہے۔ زبان کی تعلیم و تربیت ادب کی تعلیم پر مقدم ہے، اگر زبان نہیں آتی تو ادب نہیں آسکتا اور اس کی قبل از وقت تعلیم ضیاعِ وقت ہے۔ ہندوستان میں زبان کے دھوکہ میں اور عربی زبان کے نام سے اعلیٰ عربی ادب کی تعلیم دی جارہی ہے، جو اکثر اوقات بے بنیاد اور بے نتیجہ ثابت ہوتی ہے۔ ہلالی صاحب کہتے تھے کہ "حریری" اور "متنبی" و "حماسہ" ادب عربی کی اعلیٰ کتابیں ہیں جو بلاد عربیہ میں زبان کی طویل اور مسلسل تعلیم اور زبان کی مشق کے بعد پڑھائی جاتی ہیں، اور عربی ادب کی تکمیل کرنے والے فضلاء ان کو پڑھتے ہیں، لیکن ہندوستان میں یہی کتابیں ادب کا کل سرمایہ اور جمع خرچ ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان سے پہلے زبان کو ایک زندہ زبان کی طرح پڑھا جائے، ان کا یہ بھی اصرار تھا

کہ زبان کو انسانی زبان کی طرح بغیر ترجمہ کی مدد کے پڑھنا چاہیے، اس پر شیخ نے دار العلوم میں مسلسل تقریریں کیں، اور اپنے مدعا کو دلائل سے ثابت کیا۔

دوسری حقیقت یہ منکشف ہوئی کہ صرف ونحو کے قواعد زبان کی تشکیل کے اصول ہیں، جن کا درجہ زبان کے بعد ہے۔ زبان کا ذخیرہ اگر کچھ نہ ہو تو صرف ونحو کے قواعد بے کار ہیں۔ مفردات، الفاظ وجمل مکان کی اینٹیں ہیں، اور نحو کا علم اصول تعمیر کے قواعد اور انجینئر ی کا فن۔ اگر سرے سے اینٹیں نہ ہوں تو انجینئرنگ اور اصول تعمیر کا بڑے سے بڑا علم ناکارہ اور فضول ہے۔

ہلالی صاحب سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ زبان کا بہترین نمونہ تاریخ کی مستند کتابیں اور عہد عباسی کے ادباء کی غیر مصنوعی تصنیفات ہیں، اس کے لیے انہوں نے ابن قتیبہ کی ''الامامۃ والسیاسۃ''، ابن المقفع کی ''کلیلہ ودمنہ''، ابو الفرج الاصبہانی کی ''کتاب الاغانی'' اور جاحظ کے رسائل کی سفارش کی۔

یہ زمانہ دار العلوم ندوۃ العلماء میں عربی کی بہار کا تھا۔ ادھر ہلالی صاحب کا فیض عام تھا، ادھر ہمارے دوست مولانا مسعود عالم ندوی عربی کا رسالہ ''الضیاء'' نکال رہے تھے، عربی زبان وتحریر، نقد وتبصرہ گویا اوڑھنا بچھونا ہو رہا تھا۔ مصری، شامی، عراقی اور مغربی (الجزائری ومراکشی) رسائل و جرائد تبادلہ میں آتے تھے، پڑھے جاتے تھے، اور ان پر گفتگو رہتی تھی۔ یہ میری عربی اخبار بینی کی عمر کا بچپن تھا۔ عربی ادب کی کتابیں پڑھ لینے اور عرب اساتذہ کی صحبت میں رہنے کے باوجود اخبارات کا بڑا حصہ سمجھ میں نہ آتا، اس لیے نہیں کہ ہندوستانی علماء کے بقول (جو سراسر غلط فہمی ہے) یہ کسی جدید عربی میں ہوتے تھے، بلکہ طرز ادا اور اشتقاق کی ناواقفیت کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ بھائی صاحب کی مدد سے میں نے اخبار پڑھنا شروع کیا اور اس سے جتنا فائدہ اور تعبیر، اور اظہار خیال میں جتنی قدرت حاصل ہوئی، ادب وزبان کی کسی کتاب یا کتابوں سے نہیں ہوئی۔

مصری وشامی ادباء وفضلاء کے مضامین پڑھ کر ان کی فصاحت، زبان کی قدرت کا سکہ دل پر بیٹھا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عربی زبان کے خزانہ عامرہ کے نوادر جو صدیوں سے سربمہر تھے، وہ

اپنے اخبارات ورسائل کے کھلے صفحات میں روزانہ لٹاتے ہیں، اور امیر شکیب ارسلان کے بقول عہد عباسی کا ایک ادیب برسوں میں جتنا لکھتا تھا، وہ اس عصر کا ادیب وصحافی چند دنوں میں لکھ لیتا ہے، لیکن معنوی وذہنی حیثیت سے ذوق ودماغ پر ان مضامین کا کوئی اچھا اثر نہیں پڑا، اور ہمارے ہندی ذوق نے جس نے ہندوستان کے زیادہ سنجیدہ، زیادہ گہرے اور زیادہ طاقتور اسلامی ادبیات اور ماحول میں نشو ونما پائی تھی، عربوں کے قوم پرست اور وطنی افکار، مغرب سے ذہنی مرعوبیت، اور خیالات کی سطحیت کے خلاف ہمیشہ احتجاج کیا، اور ذہن نے اس کی پستی اور کمزوری صاف محسوس کی۔ ان مضامین کو میں نے ہمیشہ روحانی اذیت اور ذہنی کوفت کے ساتھ پڑھا، اس حیثیت سے امیر شکیب ارسلان کی تحریروں اور خیالات میں نسبتاً کچھ گہرائی اور پختگی اور اسلامیت معلوم ہوئی، لیکن امت اسلامیہ کے امراض کی تشخیص اور علاج کی تجویز میں اس وقت جس شخص کے خیالات و افکار میں نسبتاً زیادہ بلند نظری اور باریک بینی معلوم ہوئی، اور جس کی فراست نے متاثر کیا، وہ سید عبدالرحمٰن الکواکبی کی تخیلی کتاب ''ام القریٰ'' ہے، جواب پرانی ہو چکی ہے، اور اس کے لائق مصنف کو لوگ بھولتے جارہے ہیں، لیکن بعد میں یہ دیکھ کر کہ وہ قومیت عربیہ کے اولین نقیبوں میں ہیں، اور انہوں نے سب سے پہلے دولت عثمانیہ کے خلاف عربوں میں بیزاری پیدا کرنے کی کوشش کی، دل پھیکا ہو گیا اور عقیدت میں کمی آئی۔

۱۹۲۷ء یا ۱۹۲۸ء میں رسالہ ''توحید'' امرتسر میں جو مولانا داؤد غزنوی مرحوم کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا تھا، ''تیرھویں صدی کا مجدد اعظم'' کے عنوان سے حضرت سید احمد شہیدؒ کے متعلق مولوی محی الدین قصوری مرحوم کا ایک سلسلہ مضمون شائع ہوا۔ بھائی صاحب کے حکم سے ۱۹۲۹ء۔ ۱۹۳۰ء میں میں نے اس کا عربی میں آزاد ترجمہ کیا جو ہلالی صاحب کی اصلاح کے بعد علامہ سید رشید رضا مرحوم نے ''المنار'' میں بھی شائع کیا، اور ''ترجمۃ الامام السید احمد بن عرفان الشہید'' کے نام سے علیحدہ رسالہ کی شکل میں بھی چھاپ دیا، اس موضوع سے یہ میرا پہلا تعلق تھا۔

میری مدرسی تعلیم کا اختتام ہو چکا تھا، اور آزاد مطالعہ کا آغاز، حافظ ابن قیمؒ کی ''زادالمعاد'' میرا

کتب خانہ، میری رفیق سفر اور میری گویا اتالیق و معلم تھی۔ دینیات کے کتب خانہ کی اتنی بہتر نمائندگی ایک کتاب میں ملنا مشکل ہے۔ اگر مجھے کبھی پورے ذخیرۂ علمی سے محروم کر دیا جائے، اور صرف دو کتابوں کی اجازت دی جائے، تو میں کتاب اللہ اور "زاد المعاد" اپنے ساتھ رکھوں گا، اس نے مجھے نماز سکھائی، دعائیں اور اذکار یاد کرائے، سفر کے آداب بتائے، روزمرہ زندگی کے مسنون قواعد و احکام سکھائے، اور سنت کا ضروری علم بخشا۔

ابتدائے شباب میں جو کتابیں فرشتۂ رحمت بن کر سامنے آئیں، ان میں سے زیادہ موثر اور محسن کتاب محمد بن نصر المروزی کی کتاب "قیام اللیل" ہے۔ اس کتاب کا خاص کام یہ ہے کہ عقلی اور استدلالی طریق سے نہیں، بلکہ قلبی اور ذوقی طور پر دلچسپی اور شوق کا رخ بدل دیتی ہے، اور سارا کھیل دلچسپی اور انس ہی کا ہے، اس کتاب میں شب بیدار نوجوانوں کے ایسے موثر واقعات لکھے ہیں، اور قرآن مجید کی بعض آیات کی اتنی پراثر تفسیر، اور قیام لیل کے فضائل جمع کیے ہیں جو اگر کسی خوش قسمت نوجوان کو آغاز شباب میں مل جائیں، اور اپنا اثر کر جائیں تو ایک شیخ کامل کی بیعت سے کم نہیں۔

امام ابن تیمیہؒ کی تفسیر سورۃ النور نے بھی اس پرآشوب زمانہ میں دستگیری کی، یہ اور حافظ ابن قیم کی "الجواب الکافی" نوجوانی میں بہترین نگران اور اتالیق، اور اخلاقی محتسب و ناصح ہیں، زمانہ تعلیم کے بےشعور دور میں جس کتاب نے تعلیم سے اور معلمین سے نفع اٹھانے اور ان کے احترام اور طالب علمی کے آداب کا لحاظ کرنے کا خیال پیدا کیا، وہ صاحب ہدایہ کے ایک شاگرد کی چھوٹی سی کتاب "تعلیم المتعلم" ہے۔ اسی طرح تحصیل علم میں علوئے ہمت، عزیمت اور ذوق علم پیدا کرنے میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کی کتاب "علمائے سلف" نے مہمیز کا کام دیا، اور دل و دماغ پر علمائے سلف کی عظمت و عزیمت کا نقش ثبت ہو گیا۔ میرے نزدیک ہر سچے طالب علم کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے اور اس کو حرز جان بنا کر رکھنا چاہیے۔

والد مرحوم مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء کی تصنیفات کو الٹتے پلٹتے،

ان کا ایک مسودہ "ارمغان احباب"[۴] کے نام سے ہاتھ آ گیا، جو انہوں نے اپنی ۲۶ سال کی عمر میں لکھا ہے، اور ۱۳۱۲ھ کے طالب علمانہ سفروں کا روزنامچہ ہے، نہایت سادہ اور بے تکلف، لیکن اس نے میرے دل پر بڑا اثر کیا، مردانِ خدا کی محبت اور دین کی چاشنی محسوس ہوئی، حضرت سید احمد شہیدؒ سے اصل قلبی تعلق اسی رسالہ سے پیدا ہوا، جہاں والد مرحوم حضرت سیدنا لکھتے ہیں، وہاں دل جھوم جاتا تھا، اور دل ایک خاص کیف محسوس کرتا تھا۔

دوسری چیز جس نے حضرات اہل اللہ کی محبت وعقیدت پیدا کی اور دین کا ایک خاص مزہ معلوم ہوا، جس کو الفاظ میں ادا کرنا مشکل ہے، حضرت مولانا محمد علی بانی ندوۃ العلماء کا چھوٹا سا رسالہ "ارشاد رحمانی" ہے جس میں شیخ وقت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے کچھ حالات، حکایات وملفوظات اور سلوک وطریقت کے کچھ نکات ہیں۔ حضرت مولانا گنج مرادآبادی میرے والد مرحوم کے شیخ تھے، اور بچپن سے گھر میں آپ کا ذکرِ خیر سنا تھا۔ اس روحانی تعلق اور ذہنی ربط سے کتاب ذوق وشوق سے پڑھی، محبت کے اشعار، اور عاشقانہ کلمات دل میں چبھ گئے، اور تیر ونشتر کی طرح دل میں اتر گئے۔ اس سے کچھ پیشتر یا بعد والد مرحوم کا ایک مختصر سا رسالہ یا مقالہ جو "استفادہ" کے نام سے شائع ہوا تھا، بار بار پڑھا تھا، اس میں انہوں نے اپنے گنج مرادآباد کی حاضری کے حالات، اور وہاں کے مشاہدات، اور مولانا کے الطاف وعنایات کے واقعات قلم بند کیے تھے، اس نے مولانا کی محبت وعقیدت، اور اہل اللہ سے ملاقات اور استفادہ کے شوق میں اور اضافہ کیا۔

مشائخ و بزرگانِ دین کے ملفوظات کے مجموعے بھی نظر سے گزرے۔ ان مجموعوں میں حضرات چشتیہ کے ملفوظات میں سب سے زیادہ محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات "فوائد الفواد" اور حضرات نقشبندیہ کے ملفوظات میں حضرت شاہ غلام علی کے ملفوظات "درالمعارف" کا قلب پر اثر پڑا۔ اگرچہ ذہن نے حدیث کے اثر اور ایک خاص ذہنی تربیت و مطالعہ کی وجہ سے بعض باتوں کے قبول کرنے سے ادب کے ساتھ معافی چاہی، لیکن قلب نے

واقعات، اور بے ساختہ گفتگو اور خلوص کی گرمی ونرمی محسوس کی۔

فلسفۂ تصوف اور فلسفۂ اخلاق کے نکات ومباحث نے جو متأخرین صوفیہ کی کتابوں میں بہ کثرت ملتے ہیں، کبھی متأثر نہیں کیا، البتہ درد ومحبت اور سوز وگداز کی باتیں بے اثر نہیں رہتی تھیں، اور یہ تیر کم خطا جاتے تھے، درد ومحبت میں ڈوبے ہوئے اشعار اور فقرے دل پر نقش اور حافظہ میں محفوظ ہو جاتے تھے۔

ہم نے اپنے آشیانہ کے لیے
جو چبھے دل میں وہی تنکے لیے

بزرگوں کی مجالس وملفوظات کے سلسلہ میں تاریخی ترتیب کا لحاظ کیے بغیر یہ کہے بغیر آگے نہیں بڑھا جاتا کہ عرصہ کے بعد جب مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی بھوپالی کی مجالس میں حاضری کا شرف حاصل ہوا اور ان کی التفات وعنایات سے سرفراز ہوا تو ان کی زبان سے دینی حقائق ونکات، اور سلوک وتصوف کی نادر تحقیقات سن کر عالم حیرت میں پڑ گیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے ملفوظات ومجالس کے قلم بند کرنے کی توفیق بھی عطا فرمائی ۵۔ اپنے علم وفہم کے مطابق یہ کہنے میں ذرا مبالغہ معلوم نہیں ہوتا کہ عرصۂ دراز سے تزکیہ واحسان اور دینی حقائق کے سلسلہ میں ایسے بیش قیمت ملفوظات، اور ایسے گہرے علوم ومضامین سننے میں نہیں آئے۔ و الغیب عند اللہ، [اور] وفوق کل ذی علم علیم۔

طالب علمی کے باقاعدہ اختتام کے قریب ضلع رائے بریلی کے ایک مردم خیز قصبہ سلون جانے کا اتفاق ہوا، اور دو کتب خانے دیکھے، ایک زندہ ومتکلم، ایک جامد وخاموش۔ زندہ کتب خانہ مولانا شاہ حلیم عطا صاحب ۶، اور جامد کتب خانہ ان کا قیمتی علمی ذخیرہ۔ شاہ صاحب کے واسطہ سے حافظ ابن جوزی، حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم، حافظ ابن رجب اور ابن عبدالہادی وغیرہ کی بعض کتابیں دیکھیں، پھر وطن واپس جا کر "احیاء العلوم مع تخریج عراقی"، "فضل علم السلف علی الخلف"، "دفائن الکنوز"، "تلبیس ابلیس"، "مختصر منہاج القاصدین" وغیرہ منگوائیں۔ "تلبیس

ابلیس'' کے مطالعہ سے ناقدانہ ذہنیت پیدا ہوئی۔

اب اس سے پہلے کہ میں اپنی آخری محسن و موثر کتابوں کا ذکر کروں، تاریخی ادوار کے لحاظ کے بغیر ان کتابوں اور تحریروں کا ذکر کرتا ہوں، جنہوں نے بعض خاص حیثیتوں سے دل و دماغ پر کوئی اثر کیا اور کوئی قابلِ ذکر علمی فائدہ یا ذہنی تغیر پیدا کیا۔

نظام و نصاب تعلیم کے متعلق اصلاحی و تجدیدی خیالات کا تخم شیخ خلیل عرب و شیخ تقی الدین الہلالی کی مجالس درس میں دماغ پر پڑا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ماحول اور لٹریچر نے اس کا نشو و نما کیا، ندوۃ العلماء کا تخیل، اور دین و دنیا کی باہم آمیزی، اور علماء و اہل دین کی قیادت و اقتدار کی ضرورت و اہمیت کا احساس نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی کے اس خطبہ صدارت سے وضاحت و قوت کے ساتھ ہوا جو موصوف نے ندوۃ العلماء کے اجلاس ۱۹۲۴ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء۔لکھنؤ میں پڑھا تھا، اور میں نے اس کو غور سے بعد میں چھپا ہوا پڑھا، پھر مزید مطالعہ سے اس پر یقین اور اطمینان بڑھتا رہا، اور یہ دونوں چیزیں میرے علمی عقائد و نظریات کا جزو بن گئیں۔

مغربی تہذیب و نظام سے نفرت اصل میں بڑے بھائی صاحب ڈاکٹر حکیم سید عبد العلی صاحب مرحوم بی-ایس-سی، ایم-بی-بی-ایس کی صحبتوں اور مجلسوں میں پیدا ہوئی، جو اس سے براہ راست واقفیت رکھتے تھے، اور اعلیٰ مغربی تعلیم کے باوجود اس کی سخت تنقید اور مذمت کرتے تھے۔ یوں بھی ان کی زندگی، اور ان کا سراپا قدیم اسلامی تہذیب و ثقافت کی فتح مندی اور مغربی ماحول کے اثرات کی شکست و ہزیمت کا اعلان کرتا تھا، اس نفرت کو جو زیادہ تر قلبی تھی، مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کے ''سچ'' اور ''صدق'' کے پرچوں نے مستحکم اور دماغی بنا دیا۔

مغربی تہذیب کی تاریخ سمجھنے میں اور لادینیت و مادیت کے ارتقاء کی اس منزل کی توجیہ میں ڈریپر کی پرانی کتاب ''معرکہ مذہب و سائنس'' (مترجمہ مولانا ظفر علی خاں مرحوم) اور لیکی کی ''تاریخ اخلاق یورپ'' (مترجمہ مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی) نے بڑی مدد دی، اور اس

سے بڑا مواد ملا جس سے اپنے مضامین و استدلال میں بہت کام لیا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے مضامینِ ترجمان القرآن اور ان کی کتاب ''تنقیحات'' نے اور زیادہ وضاحت و تقویت پہنچائی۔ مولانا ابوالاعلیٰ کے ''ترجمان القرآن'' کے مضامین نے طرزِ استدلال اور طرزِ تحریر پر بھی اثر ڈالا، اور ان کی تحریروں نے ذوق وفکر کو متاثر کیا۔

مغربی تہذیب کے مزاج اور اس کے حقیقی نقائص، اسلامی تہذیب سے اس کے بنیادی و اصولی تضاد اور دونوں کے اتحاد کے عدم امکان کے متعلق سب سے زیادہ واضح اور پر مغز چیز محمد اسد صاحب کی کتاب Islam at the Crossroads معلوم ہوئی جس کا لفظ لفظ دل نشیں ہوا۔ عرصہ دراز کے بعد ان کی دوسری فکر انگیز، لیکن دلچسپ کتاب Road to Mecca شائع ہوئی، جس کا عربی ترجمہ ''الطریق الی مکۃ'' انہوں نے از راہ عنایت مجھے خود بھیجا، یہ اس اجمال کی تفصیل، اور اس نظریہ کی عملی تطبیق تھی جو انہوں نے اپنی پہلی کتاب میں پیش کیا تھا۔ میں نے ان کی اجازت سے اس کا ترجمہ اور تلخیص ''طوفان سے ساحل تک'' کے نام سے شائع کیا، یہ کتاب ہر جویائے حق اور صاحب ذوق کے پڑھنے کی ہے۔

۳۹-۱۹۳۸ء میں مصر کے فاضل مولف ڈاکٹر احمد امین کی ''فجر الاسلام'' (جلد-۱) اور ''ضحیٰ الاسلام'' (جلد-۳) کے مطالعہ کا موقعہ ملا، یہ عہد نبوی اور عہد اموی وعباسی کی فکری، ادبی، اخلاقی، سیاسی وعلمی تاریخ ہے جس میں واقعات سے نتائج اخذ کیے ہیں، جزئیات سے کلیات قائم کیے ہیں اور ہر دور اور حیات انسانی کے ان مختلف شعبوں پر مجموعی نگاہ ڈالی ہے۔ کتاب مصنف کی قوت ملاحظہ اور حسن استنتاج کا اچھا نمونہ ہے، اور اگرچہ موجودہ عصری ومغربی تاثرات سے کلیتہً پاک نہیں، اور اس کے مطالعہ سے ذخیرۂ حدیث پر اعتماد کسی حد تک متزلزل ہو جاتا ہے، اور اس کی بعض بنیادی شخصیتوں کے بارے میں وہ عظمت اور عقیدت قائم نہیں رہتی جو ایک مسلمان کے دل میں قائم رہنی چاہیے، مگر میری سادہ لوحی کہیے، یا ناقدانہ نظر کی کمی کہ مجھے مصنف کی اس کمزوری کا پورا احساس اس وقت نہیں ہونے پایا، اس کا صحیح احساس وعلم اور اس سے اذیت اس وقت ہوئی جب

میں نے ڈاکٹر الشیخ مصطفیٰ السباعی کی فاضلانہ کتاب ''السنۃ ومکانتھا فی التشریع الاسلامی'' پڑھی جس کے مطالعہ کی سفارش فن حدیث کے ہر طلب علم سے ہے۔ اس کے باوجود ڈاکٹر احمد امین سے خیالات میں بڑا تواردمعلوم ہوا، کئی جگہ حواشی پر اختلاف یا اظہار خیال کیا، یا مصنف کو بے اختیار داد دی، لیکن سب سے زیادہ فائدہ جوان کتابوں کے مطالعہ سے حاصل ہوا، وہ شگفتہ، شیریں اور علمی طرز تحریر کا ہے جس میں احمد امین اپنے معاصرین میں خاص امتیاز رکھتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام کے ''تذکرہ'' سے امام احمد بن حنبل اور محدثین کی عمومی عظمت دل ودماغ پر قائم ہوئی، ''تذکرہ'' اور ''الہلال'' کے ادبی سحر حلال نے مسحور کیا۔ ''ترجمان القرآن'' کی دوسری جلد سے تفسیر اور فہم قرآن کے بعض نئے گوشے سامنے آئے، اور فکر میں وسعت پیدا ہوئی۔ سورۂ یوسف پر جو کچھ انہوں نے لکھا ہے، وہ نہ صرف قرآنی نکتہ شناسی کی ایک مثال، بلکہ ادب عالی کا ایک زندہ جاوید نمونہ ہے۔

جب ترجمۂ قرآن اور تفسیر کی تدریس کی خدمت دارالعلوم میں سپرد ہوئی، تو مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے حواشی کی قدر آئی، جن میں انہوں نے مفسرین کے اقوال کا عطر اور ان کی تحقیق کا وہ حصہ نقل کر دیا ہے جس کو اس زمانہ کا سلیم ذہن آسانی کے ساتھ قبول کر لیتا ہے۔ اس میں مولانا کی سلامت فکر، حسن انتخاب اور تحریر کی شگفتگی بخوبی عیاں ہے۔ میں نے دیوبند کی ایک ملاقات میں مولانا سے اپنا یہ تاثر ظاہر کیا، مولانا کو بڑی مسرت ہوئی، اور بعض صاحبوں سے اس کو نقل کیا۔

جدید معلومات وتحقیقات نے تفسیر کے سلسلہ میں جو نئے سوالات پیدا کر دیے ہیں، ان کا حل تلاش کرنے میں، اور قرآنی اعجاز کے بہت سے گوشوں کو بے نقاب کرنے میں ''تفسیر ماجدی'' اور اس کے مصنف مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے تفسیری مضامین وتحقیقات سے بڑی مدد ملی، اور اپنے مطالعہ ومعلومات میں تحقیقی اضافہ ہوا۔

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کی تمام تصنیفات نقدِ کاملِ عیار، اور علم وانشاء کے لحاظ سے معیار ہیں، لیکن اس بے بضاعت کو جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ ''خطبات مدراس''

ہے۔ اگر کسی مصنف کے حصہ میں صرف یہی تصنیف آئے، تو اس کو زندہ جاوید بنادے، اور اگر مقبول ہو (جیسا کہ آثار سے بھی ظاہر ہے)، تو مغفرت کے لیے تنہا کافی ہے۔ بار بار مزے لے لے کر پڑھی، حدیث وسیرت کے نئے نئے پہلو سامنے آئے، اور اس عہد انقلاب میں اہل علم اور تعلیم یافتہ غیر مسلموں کے سامنے حدیث وسیرت پیش کرنے کی راہ معلوم ہوئی۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی کتابوں میں بڑی معلومات اور مواد ہے۔ بہت سے لوگوں کا ان کے مخصوص طرز تحریر، اور بات سے بات نکالنے کی وجہ سے جی نہیں لگتا، لیکن میرا ہمیشہ ان کی کتابوں میں جی لگا، اور اپنے علم میں اضافہ ہوا۔ خاص طور پر ان کی کتاب ''النبی الخاتم'' سیرت پر بڑی البیلی کتاب ہے۔ اسی طرح ان کی دوسری کتاب ''[ہندوستان میں مسلمانوں کا] نظام تعلیم و تربیت'' بڑی پراز معلومات اور موثر کتاب ہے۔ تیسری کتاب ''تدوین حدیث'' بڑی مبصرانہ اور نکتہ ورانہ تصنیف ہے۔ ان کا مضمون ''مجدد الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ'' بھی بڑی بصیرت و معلومات کا ذریعہ بنا، اور اس سے ان کے دوسرے مقالے جو ''الفرقان'' شاہ ولی اللہ نمبر میں شائع ہوا تھا، تاریخ ہند کے نئے گوشے سامنے آئے۔

''حیاتِ جاوید''، ''وقارِ حیات'' اور ''تہذیب الاخلاق'' کے پرانے فائل سے ہندوستانی مسلمانوں کے موجودہ مزاج اور ان کے موجودہ تعلیمی وسیاسی رجحانات کے سمجھنے میں بڑی مدد ملی، جس کی تکمیل ''حیاتِ شبلی'' سے ہوئی۔ مولوی سید طفیل احمد صاحب کی ''حکومتِ خود اختیاری'' اور ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' سے ہندوستان کی برطانوی سیاست اور مسلمانوں کے سیاسی تنزل اور ذہنی تغیر کی توجیہ ہوئی۔ ہندوستان کی اسلامی، دینی وعلمی تاریخ کا سب سے بڑا خزانہ گھر میں موجود تھا، کبھی خیال نہیں آیا تھا، حیدرآباد سے اشاعت کی تحریک ہوئی، تو والد مرحوم کی تصنیف اور سرمایہ حیات ''نزہۃ الخواطر'' کی آٹھ جلدیں ایک سے زائد بار پڑھیں۔ ان کتابوں سے ہندوستان کی آٹھ سو برس کی جیتی جاگتی تاریخ آنکھوں کے سامنے آ گئی، علماء و مشائخ، اہل درس واہل تصنیف، اہل ذوق واہل کمال، سلاطین و وزراء، امراء و رؤسا کے ایسے حالات اور ہندوستان کی علمی تاریخ

کے ایسے قیمتی نوادر و نکات مفت میں مل گئے، جن کے لیے سینکڑوں کتابیں الٹنے اور ہزاروں صفحات کھنگالنے سے بھی کام نہ چلتا۔ یہ ایک بہت بڑی ثقافت اور معلومات کا خزانہ تھا جس کو ہندوستان کا کوئی طالب علم جو علم سے اپنا انتساب کرتا ہو، نظر انداز نہیں کر سکتا، اور جس کے بغیر آدمی اپنے ملک ہی میں اندھیرے میں رہے گا۔ علمی طور پر کسی کتاب کے مواد اور علمی ذخیرہ سے اتنا کام نہیں لیا، جتنا ''نزہۃ الخواطر'' کی ان ضخیم آٹھ جلدوں کے تاریخی معلومات سے جن کی تلاش کے لیے تاریخ و تصوف کی کتابوں کے ہزاروں صفحات دیکھنے کی نہ توفیق تھی نہ فرصت، اور نہ یہ اندازہ کہ ان کو کہاں تلاش کرنا چاہیے، اور کس جگہ سے وہ دستیاب ہو سکتے ہیں۔ میری محرومی کہ میں اپنی کم سنی کی وجہ سے اپنے والد سے کوئی استفادہ نہ کر سکا، لیکن اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، وہ ایسا علمی سرمایہ چھوڑ گئے ہیں کہ ساری عمر اس سے استفادہ کا موقع ہے۔

زندگی کے طویل تر دور میں دماغ پر علامہ اقبال مرحوم کا بڑا غلبہ رہا ہے، اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی معاصر شخصیت کے افکار کا اتنا گہرا اثر دماغ پر نہیں پڑا جتنا علامہ اقبالؒ کے کلام کا، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان خیالات اور تمناؤں کی ترجمانی کرتے ہیں جو روح و جسم میں پیوست ہو چکی ہیں۔ اقبال اور ان کے کلام پر اردو میں اتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں جو شاید کسی معاصر شخصیت اور اس کے فکر پر شائع نہیں ہوئیں، لیکن ان میں سب سے زیادہ پر مغز اور روح پرور کتاب ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی ''روح اقبال'' معلوم ہوئی۔

علامہ مرحوم سے ۱۳۵۶ھ / ۱۹۳۷ء میں دوسری ملاقات کی، اور کئی گھنٹے ان کے التفات و ارشادات سے محظوظ رہا، جس کا خلاصہ پنجاب کے ایک رسالہ میں ''عارف ہندی کی خدمت میں چند گھنٹے'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ بلاد عربیہ کے مسلمانوں کی بے التفاتی اور ناشناسی پر دل کھول کھول کر رہتا، اور ٹیگور کی قدر افزائی پر غصہ آتا۔ علامہ مرحوم کی وفات کے بعد مصر میں پڑھے جانے کے لیے ایک مفصل و طویل مضمون علامہ مرحوم کی زندگی و خصوصیات پر لکھا اور بعد میں عالم عربی میں ان کے تعارف کی سب سے زیادہ کامیاب کوشش کی توفیق ''روائع اقبال'' کے ذریعہ

ہوئی، جس نے بلادِ عربیہ کے نوجوانوں میں بڑی مقبولیت حاصل کی۔ ابتدائی استغراق و انہماک کے دور میں تنبیہ ہوئی کہ کسی انسان کے کلام سے اس قدر انہماک اور شیفتگی اچھی نہیں۔ اصل شغف اور انہماک کی چیز اللہ تعالیٰ کا ابدی پیغام اور کلام ہے جو قرآن مجید کی شکل میں محفوظ ہے، اور جس کو جو کچھ ملا ہے، اسی سے ملا ہے، لیکن اب بھی ان کے اشعار خون میں تموج اور جذبات میں حرکت پیدا کر دیتے ہیں، اور عالم اسلام کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے اب بھی اس کو طاقت و خود اعتمادی کا ایک بہت بڑا سرچشمہ سمجھتا ہوں۔

مطالعہ کے سلسلہ میں مولانا عبدالباری صاحب ندوی کی ایک چھوٹی سی کتاب ''مذہب و عقلیات'' پر نظر پڑی جو ''بہ قامت کہتر و بقیمت بہتر'' کی صحیح مصداق ہے۔ ذوق و ذہن نے اس کو پورے طور پر اپنا لیا۔ اس رسالہ سے عقل و نقل کے حدود اور تجربہ و علم انسانی کی نارسی اور کوتاہی و ناپائیداری اور انبیاء علیہم السلام کے علم کی قطعیت کا ایک ابتدائی تخیل حاصل ہوا جو مطالعہ میں بہت کام آیا۔ اس کے بعد قدیم و جدید فلسفہ، اور اس کی تاریخ پر جو کچھ ہاتھ آیا، پڑھا، مگر اس ابتدائی تخیل میں ذرا تزلزل واقع نہیں ہوا، بلکہ جس قدر پڑھا: ''ان ھم الا یخرصون'' اور ''بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ و لما یأتھم تاویلہ'' کی تفسیر و توضیح ہوتی رہی۔ حافظ ابن تیمیہ کی ''تفسیر سورۂ اخلاص'' اور ''کتاب النبوات'' کے اشارات سے مزید مدد ملی، لیکن اس نقش کو پختہ حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات نے کیا۔

میرے معلم و مربی میرے برادر معظم ڈاکٹر سید عبدالعلی مرحوم، جن کی اصابتِ رائے، خداداد سلامتِ فکر، استقامت اور گہرا علم زندگی کی ہر منزل، اور ہر موڑ پر میرا دستگیر رہا، برابر حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات اور حضرت شاہ ولی اللہ کی ''ازالۃ الخفاء'' کے مطالعہ کی تاکید فرماتے رہے، لیکن نوعمری کی سطحیت اور کم سنی کی عجلت کی وجہ سے کبھی دو چار صفحے سے زیادہ نہ پڑھ سکا۔ دفتر اول کا پہلا مکتوب جو حضرت نے اپنے مرشد خواجہ باقی باللہ کو لکھا ہے، اور جس میں اپنے بہت سے واردات اور راہ سلوک کے تجربات لکھے ہیں، ہمیشہ ہمت شکن ثابت ہوا، اور جس طرح بدشوق بچے

ہمیشہ قرآن کی تلاوت میں پہلا پارہ پڑھ کر چھوڑ دیا کرتے ہیں، میں بھی اس مکتوب کے چند صفحات پڑھ کر کتاب ہاتھ سے رکھ دیا کرتا تھا، لیکن ایک باراس کا عزم کرلیا کہ "مکتوبات" کا لفظ بہ لفظ مطالعہ کروں گا، چاہے بڑا حصہ سمجھ میں نہ آئے، چنانچہ اس کے چاروں [کذا، تینوں] دفتر پڑھے، لفظ بہ لفظ، دل لگا کر اور لطف لے لے کر پڑھے۔ بے استعدادی، قوتِ مطالعہ کی کمی اور علومِ عقلیہ و آلیہ کی بے بضاعتی قدم قدم پر عناں گیر رہی، لیکن ایک عامی کے حصہ میں جو کچھ آیا، اس پر اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ

آنچہ ساقی ماریخت عین الطاف است

ایک عرصہ کے بعد حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے مکتوبات کے مطالعہ کی سعادت حاصل ہوئی، حضرت مجدد اور حضرت مخدوم بہاری کے مکتوبات کے مطالعہ سے علم کا ایک نیا عالم آنکھوں کے سامنے آ گیا، وحی و نبوت کی قطعیت، مقامِ نبوت و منصب رسالت کی بلندی و برتری اور خصائصِ نبوت وانبیاء اور نبوت و ولایت کے لوازم و مابہ الامتیاز چیزوں کے متعلق جو نکتے اور حقائق لکھے ہیں، ان پر دقت فکر کے لحاظ سے یونان وعجم کا پورا فلسفہ سو بار قربان، اور وجد آفرینی اور کیف آوری کے لحاظ سے شعراء کے دواوین اور ادب کی بیاضیں ہزار بار نثار۔ مکتوبات مجددی سے تذکرہ کے آخر میں سنت و بدعت کے بارے میں جو مجددانہ کلمات وتحقیقات قلم سے نکلی ہیں، ان سے بڑا شرح صدر اور یقین کا اضافہ ہوا، نیز دور اکبری و جہانگیری میں دین کی نصرت وحمایت کے سلسلہ کے مکتوبات نے دینی حمیت و غیرت کو بیدار کیا، اور افسردہ قلب و جسم میں دین کی حرارت پیدا کی، انسانی تصانیف اور تحریروں میں جن پر زمانہ گزر چکا ہے، کم چیزوں میں ایسی زندگی اور قلب کی حرارت دیکھی جتنی ان دونوں حضرات کے مکتوبات میں پائی جن پر صدیاں گزر چکیں، مگر وہی زندگی اور تاثیر موجود ہے جو عموماً لکھنے کے وقت ہوتی ہے۔

میرے محترم دوست اور دینی کاموں میں رفیق کار مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے "الفرقان" کا شاہ ولی اللہ نمبر نکالنے کا ارادہ کیا تو اس بے بضاعت سے بھی فرمائش کی کہ اس میں

حصہ لے۔ میں نے ''شاہ ولی اللہ بحیثیت مصنف'' کا عنوان اپنے لیے منتخب کیا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ شاہ صاحب کی تصنیفات پر ایک نظر ڈالی جائے، کچھ پہلے دیکھی تھیں، کچھ نہیں دیکھی تھیں۔ اس سلسلہ میں ''ازالۃ الخفاء'' کے بالاستیعاب پڑھنے کی نوبت آئی، یہ اپنی نکتہ آفرینی کا دوسرا نمونہ تھا۔ انسانی تصنیفات میں کم کتابوں سے اتنا متاثر ہوا ہوں گا، جتنا مکتوبات اور ''ازالۃ الخفاء'' سے، علم کا چشمہ ابلتا نظر آتا ہے، آدمی ایک نکتہ کا لطف نہیں لینے پاتا کہ دوسرا نکتہ سامنے آجاتا ہے، اور دوسرے سے فارغ نہیں ہونے پاتا کہ تیسرا نکتہ سامنے آجاتا ہے۔ آیات کی تفسیر و تطبیق میں اور خلافت کے خصائص، نیز دینی انحطاط و تغیر کی تدریجی تاریخ کی تدوین میں جو کچھ لکھا ہے۔ وہ علمی پختگی کے ساتھ کیا لطف و لطافت میں ادب و شاعری سے کم ہے؟

''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں نے مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کے تلمیذ رشید اور پنجاب کے مشہور عالم و مصلح حضرت مولانا احمد علی لاہوری سے پڑھی تھی، اور دماغ پر اس کی عقلیت، محکم استدلال اور شاہ صاحب کی باریک بینی کا اثر اسی سے قائم ہوا۔ ''حجۃ اللہ البالغۃ'' سے علمی و اصولی مباحث اور متکلمانہ و فلسفہ آمیز دینی کتابوں کے سمجھنے کی استعداد پیدا ہوئی، اور اس حیثیت سے اس نے بڑا احسان کیا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پچھلی صدیوں کی کسی شخصیت سے ذہن اتنا متاثر اور اس کی تحقیقات سے اتنا متفق نہیں، جتنا شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کی کتابوں سے۔ اگر اپنے فکر و مسلک کے لیے کسی مکتب خیال کا تعین ضروری ہے، تو میں انھیں کا نام لے سکتا ہوں، اور در حقیقت ہمارا تعلیمی و فکری نسب و شجرہ انھیں پر ختم ہوتا ہے۔

شاہ صاحب کے نامور پوتے شاہ محمد اسماعیل صاحب شہید کی عقیدت خاندانی ورثہ ہے، لیکن ان کی شہرہ آفاق اور مسلم ذکاوت اور وفور علم کا اندازہ صرف ''منصب امامت'' سے ہوا، جو اس موضوع پر میرے محدود علم میں اپنی طرز کی منفرد تصنیف ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب کی مختصر تصنیف ''الفوز الکبیر فی اصول التفسیر'' (جس کو میں شاہ صاحب کی قلمی بیاض کہتا ہوں۔) کے بعض علمی اشاروں اور مختصر نکتوں نے قرآن مجید۔ کرمطالعہ و تفسیر میں

بڑی رہنمائی کی، اور شاہ صاحب کے بعض مختصر جملوں، اور تھوڑے لفظوں سے پورے پورے مضامین کے راستے، اور مطالعہ قرآن میں ذہن کی بہت سی گرہیں کھل گئیں۔

حضرت سید احمد شہید کے ملفوظات کے مجموعہ ''صراط مستقیم'' (مرتبہ مولانا اسماعیل شہید، مولانا عبدالحی) کو بہت دیر میں دیکھا، مگر تصوف کے اچھے ذخیرے اور ائمہ تصوف کے ملفوظات، خصوصاً حضراتِ چشت کے پورے سلسلۂ ملفوظات کے مطالعہ کے بعد دیکھا، اور معلوم ہوا کہ تصوف کے لٹریچر میں یہ بالکل ایک انقلابی کتاب ہے۔ سلوک راہِ نبوت، اور تقرب بالفرائض کے موضوع کے علاوہ جس کے سید صاحب امام تھے، اور جو اس عصر کے لیے تزکیۂ نفس اور قرب الی اللہ کی سب سے آسان، بے خطر اور وسیع شاہراہ ہے، طریقت و حقیقت اور سلوک و تربیت کے متعلق جو نکتے اور حقائق لکھے ہیں، وہ خداداد ذکاوت، علومِ نبوت سے فطری مناسبت، اعلیٰ روحانیت اور دقتِ نظر کی دلیل ہیں، اہلِ ظاہر اور اہلِ معرفت کے مختلف فیہ مسائل میں جو محاکمہ کیا ہے، اور جو فیصلہ کن باتیں کہی ہیں، وہ ان کی اعلیٰ سلامت طبع، دماغی توازن و اعتدال اور میانہ روی کی شاہد ہیں۔ کاش! اس کتاب کی شایانِ شان خدمت ہوتی، اور نئے طرز پر مرتب کر کے پیش کی جاتی۔

ان کتابوں کا ایک فیض یہ تھا کہ علومِ نبوت سے وحشت اور اجنبیت جو وضعی اور صناعی علوم، اور تصنیفات سے پیدا ہو جاتی ہے، دور ہوئی۔ اس کی بری بھلی تمیز پیدا ہوئی کہ علمی اصطلاحات اور زمانہ کی زبان کے بغیر بھی علوم و حقائق ادا کیے جا سکتے ہیں، اور کتابوں کے راستہ کے علاوہ کچھ اور بھی راستے ہیں، جن سے وہ علوم آتے ہیں جو کتابوں کے صفحات میں مقید نہیں کیے جا سکتے۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ مغز ہو اور چھلکے نہ ہوں، معانی ہوں اور زیادہ الفاظ نہ ہوں، متن ہو اور حواشی نہ ہوں۔

اس عصر کے عارف مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی (م ۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۴ء) سے ملا، تو ان کی باتیں اور ان کے معارف سمجھنے میں نسبۃً سہولت ہوئی۔ حسن الفاظ اور حسن ادا کا خیال، زمانہ کی زبان اور علمی اصطلاحات کی تلاش مقصود کے سمجھنے میں حجاب نہ بن سکی۔ میں نے ایک موقع پر

عرض کیا کہ اگر میں نے حضرت سید احمد شہید کے حالات نہ لکھے ہوتے، اور حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات نہ پڑھے ہوتے تو مجھے آپ کی باتوں سے بڑی وحشت ہوتی، مولانا نے اس کو پسند فرمایا، اور دوسروں سے نقل کیا۔

میرے قرآن مجید کے مطالعہ میں مولانا احمد علی صاحب کی مجلسِ درس کا فیض اور برکت شامل ہے۔ درسی و متداول، اور بعض غیر متداول ضخیم تفسیریں، بعض لفظ بہ لفظ دیکھیں، لیکن اصل فائدہ متنِ قرآن کے سادہ اور بار بار کے پڑھنے سے ہوا۔ اس سلسلہ میں اس کا اظہار ضروری ہے کہ قرآن مجید سے اپنا حصہ لینے میں ضروری علمی ولسانی واقفیت کے بعد دو چیزیں سب سے زیادہ مفید ثابت ہوتی ہیں، ایک علوم نبوت و مزاج نبوت سے مناسبت رکھنے والے اشخاص کی صحبت جن کی معاشرت وزندگی کان خلقہ القرآن کا پرتو ہو، اور جنہوں نے انا القرآن الناطق (حضرت علیؓ کا مقولہ) کہنے والے کی قلبی وذوقی وراثت میں حصہ پایا ہو۔ ان حضرات کے علوم کی تازگی و شگفتگی، بے آمیزی اور نکھار اور علم کی وسعت و گہرائی سے قرآن مجید کے الفاظ کی وسعت وعمق کا ایک قیاسی اندازہ ہوتا ہے۔ کئی الفاظ جو "لسان العرب" اور "مفردات غریب القرآن" سے اور کئی آیات جو زمخشری کی ادبی تفسیر "کشاف"، امام رازی کی عقلی تفسیر "فتوح الغیب" اور ابن کثیر کی نقلی تفسیر سے حل نہیں ہوتیں، وہاں باتوں باتوں میں حل ہو جاتی ہیں۔ الفاظ و معانی میں نئی وسعت اور قوت نظر آتی ہے جو پہلے نظر سے اوجھل تھی۔

دوسری چیز یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جن راستوں پر چلے ہیں، ان پر چلنے سے قرآن مجید کھلتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی جو کیفیات بیان کی گئی ہیں، ان کا احساس ہوتا ہے۔ قوموں نے اپنے پیغمبروں کو جو جواب دیے ہیں، کان وہی آوازیں سنتے ہیں، اور آنکھیں وہی منظر دیکھتی ہیں۔ جو اشکالات اور شبہات علم کلام کی کتابوں نے، اور کتابی مطالعہ نے فرضی طریقہ پر پیدا کر دیے ہیں، وہ وہاں بے حقیقت ہو جاتے ہیں۔ قرآن مجید کے سمجھنے کے یہ دو طبعی طریقے ہیں۔

سنا ہے کہ جب قرآن مجید میں آدمی کا جی لگنے لگتا ہے، تو انسانی تصنیفات سے جی گھبرانے

لگتا ہے۔ انسانی کتابیں، انسانی تحریریں، انسانی تقریریں پست اور بے مغز معلوم ہونے لگتی ہیں، ادباء اور حکماء اور مفکرین کی باتیں طفلانہ اور عامیانہ نظر آتی ہیں، جن میں کوئی گہرائی اور پختگی نہیں معلوم ہوتی۔ سفید کاغذ پر چھپے ہوئے سیاہ نقش ونگار کاغذی پھول معلوم ہوتے ہیں، جن کا رنگ ہے خوشبو نہیں۔ انسان کا علم اتھلا اور خالی معلوم ہونے لگتا ہے، اور اس کا دیر تک پڑھنا ذوق اور روح پر بار ہوتا ہے۔ ہر وہ چیز جو علومِ نبوت کے سرچشمہ سے نہ آئی ہو، مشتبہ اور الفاظ کا طلسم معلوم ہوتی ہے۔ تسکین صرف وحی و نبوت کے راستہ سے آئے ہوئے علم سے ہوتی ہے، جس کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا تک پہنچایا، اور جو وحی کی زبان میں قرآن مجید میں، اور عربی زبان میں حدیث میں محفوظ ہے۔

دادیم ترا از منزل مقصود نشان
گر ما نہ رسیدیم شاید تو رسی

—— ۲ ——

[مولانا علی میاں ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری۔ پٹنہ تشریف لے گئے جہاں انہوں نے "خدا بخش سالانہ خطبہ" پیش کیا۔ "علم ادم کے رابطہ کی ضرورت و افادیت" کے موضوع پر خطبے کے آخر میں انہوں نے اپنے مطالعے کا ذکر کیا، یہی آخری حصہ پیش خدمت ہے۔ مولانا علی میاں نے اِس میں اپنی علمی و مطالعاتی زندگی کی بعض محسن کتابوں کا تذکرہ دہرانے کے ساتھ مزید اضافے کیے ہیں۔ مرتب]

---میں بجائے اس کے کہ ان کتابوں کا ذکر کروں جن سے معلومات حاصل ہوئی ہیں اور جن کا ممنونِ احسان ہوں اور جن کی وجہ سے محدود صلاحیت ہی سہی، لیکن اس درجہ کی صلاحیت پیدا ہوئی کہ لکھ پڑھ سکتا ہوں، عربی میں بھی اور اردو میں بھی، ان کے بجائے ان کتابوں کا ذکر کرنا چاہتا

ہوں جنہوں نے گہرا اثر ڈالا اور ایک انقلاب انگیزی کا کام کیا، لوگوں نے ایسی کتابیں تو لکھی ہیں جن میں کتابوں کی فہرست آ گئی ہے کہ کیا کیا پڑھا، لیکن ضرورت تھی کہ ان کتابوں کے نام لیے جاتے، اور اچھے پڑھنے لکھنے والے دانشوران کتابوں کا ذکر کرتے جن کتابوں کے مطالعہ سے ان میں انقلاب پیدا ہوا۔

میں ان چند کتابوں کا ذکر کرتا ہوں۔ جنہوں نے میرے محدود رقبہ علم میں، رقبہ عمل میں اور رقبہ حیات میں، میرے دائرہ فکر میں انقلاب برپا کیا، شاید بعض لوگوں کو کچھ خیال پیدا ہو، ان کے پڑھنے، ان کے دیکھنے کا، ورنہ کتابیں اپنی تعداد کے لحاظ سے، صفحات کے لحاظ سے، اپنی ضخامت کے لحاظ سے نا قابل شمار ہیں۔

سب سے پہلے ''مسدس حالی'' کا اثر پڑا، ''مسدس حالی'' میں حضورؐ کے بارے میں جو لکھا گیا:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ

اس کے بعد صحابہ کرامؓ کی تعریف بھی انہوں نے بڑے دلکش و دل نشیں انداز میں کی ہے۔
میرا خاندان ایک علمی خاندان تھا، میرے والد محترم مولانا حکیم سید عبدالحئیؒ صاحبؒ ہندوستان کے چیدہ ترین اور عظیم ترین مصنفین میں تھے جنہوں نے ایک کتاب آٹھ جلدوں میں ''نزہۃ الخواطر'' کے نام سے لکھی جس میں ساڑھے چار ہزار شخصیتوں کا حال ہے اور یہ بتا دوں کہ جتنی کتابیں لکھی گئیں، وہ ایک ایک صدی پر لکھی گئیں، ان کے نام بھی میں لیا کرتا ہوں۔

بڑے بڑے فضلائے عرب اور بڑے بڑے مؤرخین اور سوانح نگاروں نے ایک ایک صدی کا انتخاب کیا، لیکن ایک ایسی کتاب جو پہلی صدی سے لے کر آخری صدی تک کے لوگوں کا حال بیان کرے، وہ خود بلادِ عربیہ میں نہیں لکھی گئی، چنانچہ خود ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب مرحوم نے جو صدرِ جمہوریہ تھے، فرمایا کہ جب میں مصر کے دورہ پر گیا تو صرف آپ کے والد صاحب کی کتاب ''نزہۃ الخواطر'' لے گیا اور میں نے desk [ڈیسک] پر رکھ دی، جب کوئی مصری اسکالر آتا یا کوئی اخبار کا بڑا نمائندہ یا کسی جامعہ کا پروفیسر، وہ کہتا کہ کیا ہندوستان میں علم ہے؟ ہندوستان میں لوگ عربی جانتے ہیں؟ ہندوستان میں کوئی بڑا کام ہوا، کوئی بڑی خدمت ہوئی؟ میں کہتا یہ کتاب دیکھ لیجیے۔ مصر بھی ایسی کتاب نہیں پیش کرسکتا، اور میں بتاتا ہوں عالم عربی کے ایک سیاح کی حیثیت سے بھی اور وہاں کی جامعات میں جانے والے اور وہاں خطاب کرنے والے کی حیثیت سے بھی، کہ ایک کتاب بھی عالم عربی میں ایسی نہیں ملتی جو پہلی صدی سے چودہویں صدی پر محیط ہو، یا تو ایک صدی پر کتابیں ہیں یا پھر ایک ایک فن پر ہیں، مثلاً کوئی کتاب صرف ونحو پر ہے، کوئی شاعری پر ہے، کوئی طب پر ہے، لیکن انہوں نے ہندوستان کی تاریخ لکھی، پہلی صدی جب سے یہاں عرب آئے اور اسلام آیا، اس وقت سے لے کر اپنی وفات تک کے ناموروں کا اس میں ذکر ہے۔

دوسری کتاب لکھی ہے جو ان کا بڑا کارنامہ ہے اور ہندوستان کے لیے ایک شاہکار چیز ہے، وہ ہے ہندوستان کے علماء کی تصنیفات کی ڈائرکٹری۔ پہلی صدی سے لے کر اس وقت تک کسی فن میں بھی کسی عالم نے کوئی کتاب لکھی ہے تو اس میں اس کا ذکر ہے۔ پوری ڈائرکٹری ہندوستان کے تیرہ سو برس چودہ سو برس کی جس میں سیکڑوں کتابوں کے نام ہیں، اس فن میں یہ کتاب ہے، اس کی یہ خصوصیت ہے۔ عالم عربی کی سب سے بڑی اکیڈمی، دمشق کی ''المجمع العلمی العربی'' جس کا نام تھا، اب ''مجمع اللغۃ العربیۃ'' ہوگیا ہے، اس نے اس کو شائع کیا، دو ایڈیشن وہاں سے شائع ہوئے ہیں، ہندوستان میں اس کا ترجمہ ہوا، اور ''اسلامی علوم وفنون: ہندوستان میں'' کے نام سے دارالمصنفین

کی طرف سے شائع ہوا جو سب سے مقتدر ادارہ ہے۔ عام طور پر ہوا یہی ہے کہ لوگوں نے پورا حافظہ نہیں کیا، اب اس کی ضرورت ہے کہ ایسی کتابیں لکھی جائیں جن میں ان کتابوں کا تذکرہ ہو جو منفرد (unique) ہیں، ان کی مثال عالم اسلام اور عالم عربی میں نہیں ملتی اور ایسی بہت سی چیزیں ہیں، پھر اس کے بعد ضرورت ہے کہ جن چیزوں سے متاثر ہوئے اور انقلاب ہوا، ان کا بھی ذکر ہونا چاہیے۔

تو سب سے پہلے جو مجھے یاد ہے میری زندگی پر اثر ''مسدس حالی'' کا پڑا، انہوں نے صحابہ کرامؓ کا جہاں تذکرہ کیا ہے، پھر اسلام کی خدمت اور اس کی انقلاب انگیزی کا جہاں ذکر کیا ہے، اس کا بڑا حصہ زبانی یاد تھا، اس زمانہ میں مسلمانوں کے اکثر گھروں میں ''مسدس حالی'' پڑھی جاتی تھی، اس کے بہت سے شعر خواتین، بچیوں اور لڑکیوں کی زبان پر بھی تھے۔

اس کے بعد پھر جس کتاب کا اثر پڑا، وہ ہمارے خاندان کے ایک بزرگ سید عبدالرزاق صاحب کلامی کی کتاب ''صمصام الاسلام'' ہے، حضرت سید احمد شہیدؒ کم سے کم پٹنہ اور اس کے اطراف میں ضرور معروف ہیں اور محترم شخصیت ہیں، صادق پوران کا پیرو تھا اور اس نے ہندوستان کی آزادی میں انگریزوں کے مقابلہ میں وہ کردار ادا کیا جو (میں ایک تاریخ داں کی حیثیت سے بھی اور ایک محبّ وطن کی حیثیت سے بھی کہتا ہوں) ہندوستان میں شاید کسی علاقہ نے اتنا بڑا حق ادا نہیں کیا۔ سید عبدالرزاق صاحب کلامی سید احمد شہید کے نواسہ ہوتے تھے اور میرے والد صاحب کے حقیقی پھوپھا تھے، انھوں نے ''صمصام الاسلام'' کے نام سے پچیس ہزار اشعار میں واقدی کی فتوح الشام کو منتقل کیا، وہ شاعرانہ حیثیت سے بھی بڑے بلند کلام ہیں۔ اس کتاب میں پچیس ہزار اشعار ہیں۔ خاندان میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی حادثہ پیش آتا، کوئی غمی ہو جاتی تھی تو اس کے اثر کو کم کرنے کے لیے مستورات جمع ہوتی تھیں اور ''صمصام الاسلام'' پڑھی جاتی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے میں اس میں شریک ہوتا تھا، اپنی کم سنی کے باوجود، کیونکہ میری خالہ صاحبہ یا میری ہمشیرہ وغیرہ پڑھتی تھیں تو حالت یہ ہوتی تھی، کہ آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتی تھیں اور چہروں کا

رنگ بدل جاتا تھا، اور بالکل معلوم ہوتا تھا کہ اپنا غم بھول گیا ہے اور کسی کی شہادت کا ذکر آتا (خاص طور سے خواتین کی شہادت اور قربانیوں کا ذکر آتا) تو اپنا غم بھول جاتی تھیں، یہ بہت اچھا رواج تھا، اس وقت اس حادثہ کا اثر کم ہو جاتا تھا اور کسی کا کوئی وعظ یا تلقین یا کوئی اور کتاب اتنی مؤثر نہیں ہوتی تھی جتنی کہ ''صمصام الاسلام'' ہوتی تھی۔

پھر ''صمصام الاسلام'' کے بعد مجھے جس چیز نے متاثر کیا، وہ اکبرالہ آبادی مرحوم کا کلام ہے۔ ملک میں مغربی تہذیب کا دور آیا اور میں چونکہ لکھنؤ شہر کا رہنے والا ہوں جو تحریک خلافت اور تحریک آزادی کا بڑا مرکز رہا ہے، لیکن اس وقت انگریزی تہذیب کا اور انگریزی دانش کا، مغربی ثقافت (culture) کا اتنا اثر تھا کہ کوئی شخص اس سے بچا نہیں تھا، اس کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ اس وقت ایک لفظ چلا ہوا تھا ''ولایت''، اس سے آپ سمجھ جایئے کہ یہ کس ذہن کی غمازی کرتا ہے، جب کسی چیز کی بڑائی بیان کرنا چاہتے تھے تو کہتے تھے یہ ولایت سے آئی ہے، میں ولایت سے آیا ہوں، اس وقت دو چیزیں میرے بڑے کام آئیں، ایک اکبرالہ آبادی کا کلام، اس نے اس طلسم کو توڑا اور اس کی اصل کمزوریوں کو دکھایا اور وہ کام کیا جو بڑے بڑے دانش کدوں نے بڑی بڑی علمی، دقیق اور عمیق اور بلند مرتبہ کتابوں نے کیا ہوگا، ان کا کلام جب پھیلا تو اس سے مغربی تہذیب کا تسلط، اس کی sovereignty کم ہوئی، ان کے چند شعر پڑھتا ہوں، جن سے آپ سمجھ جائیں گے کہ کتنی بڑی حقیقت بیان کی ہے، وہ کہتے ہیں۔

لکھے گا کلکِ حسرت دنیا کی ہسٹری میں
اندھیر ہو رہا تھا بجلی کی روشنی میں

علوم مغربی کے بحر میں غوطہ لگانے سے
زباں گو صاف ہو جاتی ہے دل طاہر نہیں ہوتا

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

اکبر الہ آبادی کا بہت اثر ہوا، ایک اعتراف بالحق کے طور پر یہ بھی کہہ دوں کہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کا رسالہ ''سچ'' (جو بعد میں ''صدق'' کے نام سے نکلنے لگا) اکبر الہ آبادی کا بھی بڑا ترجمان تھا، میں جب تک رائے [بریلی] میں رہتا تھا، وہاں بھی ''سچ'' کا پرچہ آتا تھا، پھر وہ ''صدق'' کے نام سے نکلنے لگا اور میرا مولانا سے ذاتی تعلق اور رابطہ قائم ہوا، اس وقت لاہور سے ''زمیندار'' آتا تھا جس میں مولانا ظفر علی خاں کی نظمیں شائع ہوتی تھیں، وہ نظمیں ایسی زلزلہ انگیز ہوتی تھیں اور جذبات پر ایسی اثر انداز (زبان کے لحاظ سے بھی اور زورِ بیان کے لحاظ سے بھی) کہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

اس کے بعد اقبال کے کلام نے دل و دماغ کو متاثر کیا، یہ عرض کردوں کہ اقبال کے کلام میں ''بانگ درا'' نے اتنا مجھ پر اثر نہیں ڈالا، اس وقت تو یہ چیز رائج تھی، اور آپ کو معلوم ہے اقبال کا کلام وقت کے فاصلہ سے شائع ہوتا رہتا تھا، مثلاً ابھی ''بانگ درا'' آئی ہے، پھر ''ضرب کلیم'' آئی ہے، ''بال جبریل'' آئی ہے اور دوسری کتابیں، لیکن مجھ پر سب سے زیادہ اثر ''بال جبریل'' کا پڑا ہے، ان کے اشعار پڑھتا تھا اور لطف لیتا تھا، پھر خدا نے ایسی توفیق دی کہ میں نے ان کا عالم عربی سے تعارف کرایا، میں جب مصر گیا ۱۹۵۱ء میں تو میں نے دیکھا کہ مصر میں بہت زیادہ غیر ممتاز شخصیتوں پر لکھا گیا ہے اور لوگ ان سے واقف ہیں، میں وہاں کے چوٹی کے لکھنے والوں سے ملا، جن میں ڈاکٹر احمد امین، عباس محمود العقاد، احمد حسن الزیات اور سید قطب وغیرہ تھے، لیکن میں نے دیکھا کہ سارا مصر اقبال سے نا آشنا ہے اور عالم عربی بھی نا آشنا ہے، تو میں نے وہاں سے آنے کے بعد اس کا بیڑا اٹھایا، ہمت کی کہ میں اقبال کو عربی میں پیش کروں، چنانچہ پہلے میں نے مضامین کی

شکل میں یہ کام کیا، پھر پوری کتاب ''روائع اقبال'' کے نام سے لکھی اور مصر ہی نہیں، عالم عربی میں پہلی مرتبہ ان کا تعارف ہوا اور مجھے حیرت ہوئی کہ بعض عرب ادیبوں، دانشوروں کو اس کے صفحے کے صفحے یاد ہیں، مجھے خوب یاد ہے کہ امیر حسن نے جو اردن کے ولی عہد ہیں، وہاں ''موسسہ اہل البیت'' کے نام سے ایک اکیڈمی ہے، میں اس کا ممبر ہوں، انہوں نے ایک ڈنر کا انتظام کیا، اپنی طرف سے اعزاز کا، اس وقت میں تھا اور میرے بھانجے مولوی سید محمد واضح حسنی ندوی اور مفتی خلیلی صاحب تھے جو مسقط کے بہت بڑے عالم، بڑے مفتی ہیں تو مجھے حیرت ہوئی کہ انھوں نے ''روائع اقبال'' کے صفحے کے صفحے زبانی سنانا شروع کر دیے اور پھر اس کے بعد وہاں بہت سے لوگوں کو اس سے بڑی دلچسپی ہوئی اور اس کتاب کا بڑا اثر پڑا، اور اقبال سے لوگوں کا تعارف ہوا اور انہیں حیرت ہوئی کہ ایسے شاعر سے ہم ناواقف تھے جو اسلام کا صحیح ترجمان ہے اور اس نے طاقت کا پیغام، خود اعتمادی کا پیغام، اور انقلاب انگیزی کا پیغام جو اب تک کسی شاعر نے نہیں دیا تھا، دنیائے اسلام کو دیا۔

پھر اس کے بعد سب سے زیادہ جس کا اثر مجھ پر پڑا، وہ سید احمد شہید کی تحریک کا تھا، وہ ہمارے گھر کی چیز تھی، خاندان کی چیز تھی، لیکن اس کا تذکرہ بہت کم ہو گیا تھا، کہیں کہیں مجلسوں میں اس کا تذکرہ ہوتا تھا، لیکن اسی زمانہ میں مولوی محی الدین صاحب قصوری نے جو مولانا آزاد کے خاص لوگوں میں تھے، امرتسر کے ایک پرچہ ''توحید'' میں جو مولانا داؤد صاحب غزنوی کی ادارت میں نکلتا تھا، ''عصر حاضر کا عظیم مجاہد سید احمد شہید'' کے نام سے مقالہ لکھا، میرے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب نے کہا کہ تم اس کا ترجمہ عربی میں کرو، اس وقت میری عمر ۱۶-۱۷ سال تھی، میں نے اس کا ترجمہ عربی میں کیا، اسی زمانہ میں عالم عربی کے بہت بڑے محقق ادیب اور نقاد استاد علامہ تقی الدین الہلالی مراکشی، جن کا حال یہ تھا کہ جب دو بڑے ادیبوں میں جو بڑے کہنہ مشق نامور لکھنے والوں میں تھے، کسی لفظ کے بارے میں اختلاف ہوتا تھا کہ لفظ صحیح ہے یا نہیں تو ان کی طرف رجوع کرتے تھے، چنانچہ امیر البیان امیر شکیب ارسلان جو ''حاضر العالم الاسلامی'' کی چار

جلدوں کے مصنف ہیں اور علامہ سید رشید رضا میں جو شیخ محمد عبدہ کے شاگرد ہیں اور وہ جمال الدین افغانی کے شاگرد و ترجمان تھے، جب ان کا آپس میں اختلاف ہوتا تھا تو ان کی طرف رجوع کرتے تھے، اور وہ جو فیصلہ کرتے تھے مان لیا جاتا تھا، اس کے شواہد موجود ہیں۔ امیر شکیب ارسلان کی خودنوشت کتاب ''السید رشید رضا اواخاء اربعین سنۃ'' میں لکھا ہے، کہیں لفظ میں ہمارا اختلاف ہوا، ہم نے شیخ تقی الدین کی طرف رجوع کیا، انہوں نے یہ فیصلہ کیا، وہ لکھنؤ آئے تھے اور ندوۃ العلماء میں ان کو تعلیم کا عہدہ دیا جانے والا تھا۔ انہوں نے جو یہ مضمون دیکھا تو کہا کہ اگر تم کہو تو اسے علامہ سید رشید رضا کے پاس مصر بھیج دوں، اب خیال کیجیے، ۱۶-۱۷ سال کا نوجوان، اس کا مضمون علامہ سید رشید رضا جو شیخ محمد عبدہ کے شاگرد رشید ہیں، وہ ''المنار'' نکالتے تھے، انہوں نے اس مضمون کو رسالہ میں شائع کیا اور اس کے بعد انہوں نے لکھا کہ اگر مضمون نگار چاہیں تو ہم اس کو الگ رسالہ کی شکل میں بھی شائع کر سکتے ہیں، تو خدا کا شکر ادا کرنے کے سلسلہ میں کہتا ہوں کہ شاید ہندوستان میں یا بلادِ عجمیہ میں کم ایسا ہوا ہو کہ ۱۶-۱۷ سال کے نوجوان کی کتاب مصر میں شائع ہوئی ہو اور مستند سمجھی گئی ہو، چنانچہ ''ترجمۃ الامام السید احمد بن عرفان الشہید'' کے نام سے وہ رسالہ وہاں شائع ہوا اور پھر ہندوستان میں بھی پھیلا۔

مجھ پر سب سے زیادہ جس کا اثر پڑا ہے وہ حضرت سید احمد شہید کے واقعات تھے، میں بلا کسی مبالغہ کے اور بغیر کسی خودستائی کے کہتا ہوں کہ کچھ خاندانی تعلق بھی ہے کہ میں جب ان کے حالات پڑھتا تھا، دار العلوم ندوۃ العلماء کے ایک گوشہ میں (جس زمانہ میں وہاں بجلی بھی نہیں آئی تھی چراغ جلا کر، لالٹین جلا کر میں کتاب پڑھتا تھا) ''وقائع احمدی''، جو ان کے حالات میں لکھی گئی ہے یا دوسری کتاب ''منظورۃ السعداء'' جو فارسی میں ہے مولانا سید جعفر علی صاحب بستوی کی، وہ جب پڑھتا تھا تو ایک دم سے مجھے معلوم ہوتا تھا کہ رحمت کی کوئی گھٹا آ گئی ہے اور دعا کرنے کا وقت ہے اور آنسو جاری ہو جاتے اور دعا کرتا، ویسا اثر میں نے سیرت نبوی کے بعد کسی چیز میں نہیں دیکھا، مجھ پر سب سے زیادہ اثر پڑا ہے سید احمد شہید کا اور پھر اس کے بعد اس کے نتیجہ میں میں نے

''سیرت سید احمد شہید''، لکھی، پہلے ایک جلد تھی، اس پر علامہ سید سلیمان ندوی نے مقدمہ لکھا، بڑا طاقتور مقدمہ ہے، پھر دو جلدوں میں میں نے کتاب لکھی اور اس وقت تک بحمداللہ ۶، ۷ ایڈیشن نکل چکے ہوں گے اور پاکستان، ہندوستان میں بہت پھیلی، پھر اس کے بعد چودھری غلام رسول صاحب مہر (جو ایک بہت بڑے صحافی اور جرنلسٹ تھے) کہتے تھے کہ میں تیرہ چودہ سال سے یہی کام کر رہا ہوں اور کوئی دن ایسا نہیں گزرا کہ میں نے دو رکعت نماز پڑھ کر دعا نہ کی ہو، انہوں نے کتاب لکھی ''[redacted] سید احمد شہید'' چار جلدوں میں، ان کی کتاب کافی مقبول ہوئی۔ اس کتاب نے ہزاروں انسانوں پر اثر ڈالا، ان کے عقائد میں بھی اصلاح ہوئی، ان کے جذبات میں بھی ایمانی طاقت پیدا ہوئی جو بہت کم چیزوں سے پیدا ہوتی ہے۔

ابھی تک بہت کم لوگوں نے اس پر کوئی کتاب لکھی ہے کہ کس کتاب نے ان کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا، اگر کسی کتاب کا ذکر آتا ہے تو وہ ''مثنوی مولانا رومؒ'' ہے۔ خود اقبال مرحوم اس سے بڑے متاثر ہیں، وہ کہتے ہیں۔

پیر رومی مرشدِ روشن ضمیر
کاروانِ عشق و مستی را امیر

اور اردو میں کہتے ہیں۔

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف

مولانا رومؒ کے کلام کا بہت سے آدمیوں کے ذہنوں پر بڑا اثر پڑا ہے، مگر ان لوگوں نے تحریری شکل میں کوئی شہادت نہیں دی، لیکن اگر پوچھا جائے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ پورے اس برصغیر میں اور پھر ایران میں سیکڑوں ہزاروں کی تعداد میں لوگ اس سے متاثر ہوئے ہیں، یہ تو عربی، فارسی، اردو کا ذکر کیا گیا۔

میں نے جب مغربی تہذیب کی تنقید کے مطالعہ کا ارادہ کیا، میرے بڑے بھائی صاحب نے

جو بڑے مبصر تھے، مجھے انگریزی بھی پڑھوائی تھی۔ جہاں تک تاریخ، اخلاقیات اور دین کا تعلق ہے، اس میں میں نے مسلمانوں کے انحطاط، مسلمانوں کے مسند قیادت سے دست کش ہوجانے یا پیچھے ہوجانے سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا، اس کا میں نے بالکل ایک تاریخی، غیر جانبدارانہ، ایک مبصرانہ اور ناقدانہ تبصرہ کیا جو عربی زبان میں ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' کے نام سے چھپا جس کا اردو ترجمہ ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر'' کے نام سے شائع ہوا۔ عالم عربی میں میری جو کتاب سب سے زیادہ پڑھی گئی اور مقبول ہوئی، وہ یہی کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' تھی، اس کے تقریباً پچیس ایڈیشن نکل چکے ہیں، قاہرہ اور دمشق اور کویت میں اور مختلف جگہوں پر اور اردو میں جس کے ترجمے بار بار شائع ہوئے ہیں۔ بعض ادیبوں نے اس کا ذکر کیا کہ جب مجھے کوئی زوردار چیز لکھنی پڑتی ہے اور خیال ہوتا ہے کہ تحریر میں جوش ہو تو پہلے ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' کے چند صفحے پڑھ لیتا ہوں، پھر قلم اٹھاتا ہوں، یہ استاد انور الجندی کا مقولہ ہے جو اس وقت مصر کے اچھے نامور کاتب ہیں، تو اس وقت مجھے اس بات کی ضرورت ہوئی کہ غیر جانبدارانہ طریقہ پر اور غیر جذباتی طریقہ پر میں مغربی تہذیب کی کمزوریوں کو سمجھوں اور کیا اس کا donation ہے، اس نے کیا دنیا کو عطا کیا اور کیا نقصان پہنچایا، اخلاقیات کے پہلو سے، دینیات کے پہلو سے، انسانیت کے پہلو سے، تو میں نے اس وقت انگریزی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، اس میں مجھے سب سے زیادہ جن کتابوں سے فائدہ ہوا، ان میں Conflict between Religion and Science ہے، یہ ڈراپر کی کتاب ہے، اسے میں نے غور سے پڑھا اور اس کے نوٹس لیے۔ اس میں [مصنف نے] بتایا ہے کہ کلیسا اور دربار کی جو جنگ ہوئی، جو کشمکش اور تقابل ہوا، اس سے کیا فائدہ پہنچا، کیا نقصان پہنچا اور اس نے کیا اثرات ڈالے، مغربی معاشرہ، مغربی ذہن پر۔ پھر کتاب پڑھی History of European Morals، اس سے مجھے معلوم ہوا کہ یونان کا کیا اثر پڑا ہے یورپ پر، یونان نے کیا دیا اور اس میں کیا افراط و تفریط تھی، ان کے دو بہت بڑے schools of thought تھے، ایک جسے رواقی کہتے ہیں اور ایک

لذتی، بس جس میں آدمی کو مزا آئے وہی چیز لینی چاہیے، اسی کو اختیار کرنا چاہیے، یہ لذتی مکتب خیال ہے، مگر رواقی مکتب خیال ہے کہ نہیں، عقل سے کام لینا چاہیے۔ اس کتاب میں اس نے ثابت کیا ہے کہ لذتی اسکول نے یورپ پر زیادہ اثر ڈالا ہے، اس وقت یورپ فلسفہ لذتیت کا کار بند نہیں، بلکہ پابند ہے۔

امام ابن تیمیہ کی کتاب میں نے پہلے پڑھی تھی، اس لیے بہت چیزوں کی مجھے تصدیق ہوئی، انہوں نے ایک بڑے کام کی بات کہی ہے، انہوں نے کہا ہے کہ ایک چیز ہے "نفی"، اور ایک ہے "اثبات"۔ امام ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ یونان کی ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ ان کے یہاں نفی زیادہ ہے، اثبات کم ہے، حالانکہ سارا عمل، جوشِ عمل، طاقت اور انرجی سارے ذہنی و اعصابی محرکات، اعصابیت پیدا ہوتی ہے اثبات سے، نفی سے پیدا نہیں ہوتی، قرآن کیا کہتا ہے "لیس کمثله شئی" "وهو السميع البصير" اللہ تعالیٰ کی طرح کوئی چیز نہیں ہے اور وہ سمیع و بصیر ہے، لیکن جب اس کی صفت بیان کرتا ہے تو کہتا ہے **هو الخالق البارئ المصور له الاسماء الحسنى يسبح له مافى السموات والارض وهو العزيز الحكيم**، اور پھر اس سے پہلے کی جو آیتیں ہیں ۵-۱۰ صفتیں بیان کی ہیں کہ اللہ یہ ہے، اللہ یہ ہے اور ان صفتوں کا تعلق انسانی زندگی سے بھی ہے اور کائنات سے بھی ہے، اس سے آدمی میں ایک جذبۂ عمل پیدا ہوتا ہے، جذبۂ دعا پیدا ہوتا ہے، جذبۂ عبادت بھی پیدا ہوتا ہے، ایک اطمینان اور سکونِ قلب پیدا ہوتا ہے کہ میں جس خدا کا پرستار ہوں، وہ بڑا رحمان و رحیم ہے، وہ بڑا حکیم و بصیر ہے، وہ خالق ہے کائنات کا اور قادر ہے ہر چیز پر۔

پھر جس سے فائدہ پہنچا، وہ گبن کی مشہور کتاب ہے Decline and Fall of the Roman Empire- اس سے معلوم ہوا کہ رومۃ الکبری کی سلطنت سے کیا غلطیاں ہوئیں، کیا اس میں ناہمواریاں پیش آئیں اور اس میں ضعف کے سرچشمے کیا تھے، کیوں اتنی بڑی رومۃ الکبریٰ جو دنیا کی سب سے بڑی شہنشاہی تھی، اس کو زوال ہوا، اور پھر ایک کتاب Making of

Humanity پڑھی، اس میں انسانیت کی تعمیر اور تخریب کی تاریخ پر بحث کی گئی۔

آخر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اس وقت ضرورت اس کی ہے کہ لوگ ان کتابوں کی طرف توجہ کریں اور ان پر خامہ فرسائی کریں جنھوں نے ان کے اندر انقلاب [پیدا] کیا اور کس طرح سے انقلاب [پیدا] کیا؟ اور پھر ایسی منتخب اور مفید کتابوں کے پڑھنے کا مشورہ دیں۔---

——— ۳ ———

[ماہنامہ ''سیارہ'' (لاہور) نے مختلف اربابِ علم وادب سے اُن کے ذوقِ مطالعہ، تصنیف وتالیف اور ذہنی نشو وارتقاء کے حوالے سے ایک مفصل سوال نامے کے جواب حاصل کیے تھے۔ ذیل میں سوالنامہ، اور مولانا علی میاں کا جواب ماہنامہ مذکور کی اشاعت بابت ستمبر ۱۹۶۵ء سے نقل کیا جاتا ہے۔ مرتب]

سوالنامہ

۱- آپ کے اندر ذوقِ مطالعہ کب نمایاں طور پر متحرک ہوا؟ آغاز کیسے ہوا؟ اس کا نشو ونما کس طرح ہوا؟ کیسا ذہنی ماحول اس میں آپ کے لیے ممد ہوا؟ نظامِ تربیت کا اثر کہاں تک ہوا؟ کون سی شخصیتیں تھیں جنھوں نے آپ کے ذوقِ مطالعہ کو مہمیز کیا اور اِس سفر میں رہنمائی دی؟ آپ کے مطالعہ کے مختلف دور؟ ذوق میں ارتقائی تبدیلیاں؟

۲- آپ کے پسندیدہ موضوعاتِ مطالعہ کیا رہے؟

۳- آپ اُردو کے علاوہ اور کن زبانوں میں مطالعہ کرتے ہیں (انگریزی؟ عربی؟ فارسی؟ بنگلہ؟ ہندی؟ پنجابی؟ سندھی؟ پشتو؟، بلوچی، دیگر زبانیں؟)۔

۴- اردو اور انگریزی کو تقابلاً سامنے رکھ کر فرمایئے کہ دونوں میں کس زبان میں آپ کا مطالعہ زیادہ وسیع ہے؟

۵- آپ کے پسندیدہ مصنفین؟ آپ کی پسندیدہ کتابیں؟ آپ کے پسندیدہ رسائل؟ پسندیدہ شعراء؟ پسندیدہ افسانہ نگار؟ پسندیدہ مزاح نویس اور طنز نگار؟

۶- آپ اپنی دُنیائے مطالعہ میں کس ایک مصنف کو بلندترین مقام پر رکھتے ہیں جس کا آپ کی ذہنی نشوونما پر سب سے زیادہ اثر پڑا ہو؟ (خصوصاً اردو لکھنے والوں میں سے)

۷- آپ کی نگاہ میں وہ بہترین کتاب یا تحریر جس نے آپ پر بہت زیادہ اثر ڈالا ہو؟ (خصوصاً اردو زبان میں)

۸- ایسے دو چار مقالات، نظموں یا افسانوں کا ذکر جن سے آپ کی فکری یا عملی زندگی متاثر ہوئی ہو؟

۹- اُردو رسائل کے اب تک جتنے خاص نمبر آپ کی نظر سے گزرے ہیں۔ آپ کو ان میں سے بہت زیادہ پسند کون سے رہے؟ خصوصاً اگر کسی ایک کو بہترین قرار دے سکیں تو اور بھی اچھا ہے۔

۱۰- یہ بھی فرمایئے کہ مطالعہ میں آپ کی پسند کے بالمقابل آپ کی ''ناپسند'' کیا ہے؟ کن چیزوں کے مطالعہ سے آپ کی طبیعت اِبا کرتی ہے؟ آپ کوئی ایسی نگارش بتائیں جس سے آپ کو نفرت محسوس ہوئی ہو؟

۱۱- بالعموم آپ کے مطالعہ کے اوقات کیا ہوتے ہیں؟ پروگرام کس طرح چلتا ہے؟ مطالعہ کی نشست کس طرح کی آپ کو پسند ہے؟ رفتار مطالعہ کیا ہوتی ہے؟

۱۲- تنہائی اور خموشی آپ کے مطالعہ کے لیے ضروری ہے، یا آپ ہجوم اور شور وشغب میں بھی پڑھ لیتے ہیں؟

۱۳- سفر میں آپ کا مطالعہ کا تجربہ کیا ہے؟

۱۴- کیا مطالعہ کے دوران آپ کتاب پر نشانات لگاتے ہیں؟ کیا آپ الگ نوٹ یا خلاصہ لکھتے ہیں؟

۱۵- آپ کا حافظہ آپ کی وسعتِ مطالعہ کا ساتھ کہاں تک دیتا ہے؟ کیا آپ کو پڑھی ہوئی کتابوں اور مضامین کے مطالب اور اُن کے مصنفین کے نام پوری طرح یاد رہتے ہیں؟

۱۶- آپ اپنے مطالعہ، حاصلِ مطالعہ اور ذوقِ مطالعہ میں کیا اپنے گھر کے لوگوں، خصوصاً بچوں کو (اگر وہ ہوں) بھی حصہ دار بناتے ہیں؟ بچوں کی تربیتِ ذوق کے لیے آپ کے تجربات کیا ہیں؟

۱۷- کیا آپ کی ذاتی لائبریری ہے؟ اس کا حدود اربعہ کیا ہے؟ اِس میں اہم ترین کتابیں کون سی ہیں؟ خاص خاص کتابوں کو حاصل کرنے کے لیے اگر آپ کو کوئی خاص معرکہ سر کرنا پڑا ہو تو درج فرمایے۔ نمایاں شخصیتوں کی طرف سے ہدیہ میں آئی ہوئی کتابیں؟

۱۸- کتابیں مستعار دینے اور لینے کے متعلق آپ کے تجربات کیا ہیں، اور اس معاملے میں نظریہ و مسلک کیا ہے؟ کیا کچھ واقعات ایسے ہیں کہ بعض اہم کتابوں سے آپ ہاتھ دھو بیٹھے ہوں؟

۱۹- آپ ایک اوسط درجہ کے عام تعلیم یافتہ آدمی کو مشورہ دیں کہ وہ موجودہ مصروف زندگی میں مطالعہ کا پروگرام کیسے بنائے اور کتابیں کیسے فراہم کرے؟

۲۰- خاص طور پر ادبی مطالعہ کی ضرورت و اہمیت کیا ہے؟ عام آدمی کے لیے؟ طلبہ کے لیے؟

۲۱- ادبی مطالعہ کے لیے نوجوانوں کو آپ کیا رہنمائی دیتے ہیں کہ وہ کن مصنفین اور کتابوں کو لازماً پڑھیں؟ نیز آپ اردو کے ایسے موجودہ رسائل کی نشاندہی کریں جن کا مطالعہ صحت مند فکر کی نشو و نما میں مدد ہو۔

۲۲- کیا آپ کسی بہتر اور موثر اسلوب سے لوگوں کو یہ بتا سکتے ہیں کہ صرف تفریحی مطالعہ کافی نہیں، اس کے ساتھ علمی، ادبی اور معلوماتی چیزوں کا مطالعہ ضروری ہے اور پروگرام میں توازن ہونا چاہیے؟

۲۳- ڈائجسٹوں کا جو دور ہمارے یہاں شروع ہوا ہے، اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ ایک

رائے یہ ہے کہ اس طرز کے رسائل انگریزی رسائل کی جگہ لے کر اردو کے حق میں مفید پارٹ ادا کر رہے ہیں۔ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ ادبی مطالعہ کے راستے میں حائل ہو رہے ہیں۔

۲۴- آپ کے سامنے ایک مسلمان معاشرہ ہے اور یہ واضح ہے کہ نوجوانوں کی بڑی بنیادی ضرورت ہے کہ وہ اسلام کے انقلاب آفریں نظریۂ حیات، اس کے ضابطہ ونظام، اس کے تہذیب وتمدن اور اس کی شاندار تاریخ کو جانیں۔ اس سلسلے میں آپ کیا مشورہ دیتے ہیں؟ کن مصنفین اور کن کتابوں کی طرف رہنمائی دیتے ہیں؟

۲۵- کچھ لوگوں کی رائے میں قرآن ناظرہ پڑھنے کی بجائے سمجھ کر پڑھنا چاہیے، طوطے کی طرح رٹنے کا کیا فائدہ؟ آپ کی رائے اِس بارے میں کیا ہے؟

جواب

اس وقت اس حال میں یہاں [نہیں] ہوں کہ دماغ پر زیادہ زور ڈال سکوں یا کوئی مضمون پوری توجہ سے لکھوا سکوں، زیادہ وقت بستر پر پڑے ہوئے گزرتا ہے۔ اس وقت اتفاقاً آپ کے سوال نامے کا کاغذ نکل آیا اور ایک عزیز نے پڑھ کر سنایا۔ سوالات بڑی ذہانت سے مرتب کیے گئے ہیں اور طبیعت کو اکساتے ہیں۔ دل میں ان کے جواب دینے کی تحریک پیدا ہوئی، طبیعت کے مشورہ کو جو پاسبانِ عقل ہے، ذرا ہٹا کر دل کو تنہا چھوڑ دینے پر عمل کرنے کو جی چاہا۔ آپ نے انتخاب کی آزادی دے دی ہے، اس لیے ہلکے پھلکے سوالات کا جواب دے دیتا ہوں وہ بھی مختصر۔

نمبر ۱- قدیم شرفاء اور علماء کے دستور کے مطابق اور بعض خاص اسباب کی بناء پر اس سے کچھ زیادہ ہمارے گھر میں ایک وسیع موروثی کتب خانہ تھا۔ دادا صاحب اور والد صاحب رحمۃ اللہ علیہم (حکیم سید فخر الدین مصنف ''مہر جہاں تاب'' اور سید عبدالحیٔ مصنف

''گلِ رعنا'' و ''نزہتہ الخواطر'') دونوں بڑے مصنف تھے۔ یہ کتب خانہ کئی ہزار کتابوں پر مشتمل تھا جن میں عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں کی کتابیں تھیں۔ میرے بڑے بھائی صاحب (ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبدالعلی صاحب مرحوم) بڑے اچھے مربی و ماہر نفسیات تھے۔ انہوں نے کتابوں سے مانوس کرنے کے لیے اور اس موروثی دولت کی قدر کرنے کے لیے کتابوں کو دھوپ دکھانے اور ان کی حفاظت و پرداخت کے کام میں پہلے شریک کیا، پھر اس کی ذمے داری ڈالی۔ پرانی کہاوت ''کوئلوں کی دلالی میں ہاتھ کالے'' کے مطابق پہلے کتاب و مصنف کا نام پڑھنے، پھر اس کو کہیں کہیں سے دیکھنے اور مطالعہ کرنے کا شوق پیدا ہوا، اور اس سے کتاب بینی کا جو بہت حد تک موروثی اور فطری تھی، چسکا پڑ گیا اور یہ شوق لت اور بیماری کی حد تک پہنچ گیا۔

نمبر۲- میرے لیے سب سے زیادہ ذوقی اور تفریحی موضوع جس میں کبھی طبیعت پر بار نہیں پڑتا اور جس سے سیری نہیں ہوتی، تذکرے، تراجم اور سوانح حیات کا موضوع ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ دادا صاحب اور والد صاحب بڑے مؤرخ اور سوانح نگار تھے اور ان کی زندگی کا بڑا حصہ اس مشغلے میں صرف ہوا۔ اس کے بعد دوسرے درجہ میں ادبیات، خاص طور پر وہ ادبی کتابیں جن میں تکلف، آورد اور صنائع و بدائع نہ ہوں، لیکن نظم سے زیادہ نثر کی کتابیں پڑھنے کا ذوق ہے، اور وہ عربی اردو دونوں میں یکساں ہے۔

نمبر۳- سب سے زیادہ عربی میں، دوسرے نمبر پر اردو اور بضرورت انگریزی میں مطالعہ کا اتفاق ہوتا ہے۔ جب سے نظر کمزور ہوئی، انگریزی مطالعہ برائے نام رہ گیا۔

نمبر۴-۵- پسندیدہ مصنفین، پسندیدہ تصانیف اور مضامین کے متعلق میرے مضمون ''میری محسن کتابیں''۸ میں خاصا مواد آ گیا ہے۔ مزاحیہ لکھنے والوں میں مجھے پرانے لکھنے والے مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی سب سے زیادہ پسند ہیں۔ پطرس کے بعض، اور پروفیسر

رشید احمد صدیقی کے وہ مضامین جن میں زیادہ علمیت اور تفلسف نہیں ہے، پسند آتے ہیں، نیز ان کے مضامین کے مجموعوں میں سے ''گنج ہائے گراں مایہ'' بہت کامیاب اور دل آویز ہے۔

طنز نگاری میں مولانا عبدالماجد دریابادی خاص مرتبہ رکھتے ہیں۔ خاص طور پر جہاں زیادہ تلخی اور تیزی نہیں ہوتی۔ یہ احتیاط مولانا آزاد کے یہاں زیادہ ہے اوران کے ادب کے وہ حصے اگر چہ کم ہیں، لیکن [ہیں] بہت لطیف اور سبک۔

نمبر۶- یہ کہہ سکتا ہوں کہ چوں کہ ابتداء میں ندوۃ العلماء کی تحریک سے تعلق رکھنے والوں کی تصنیفات اور تحریریں زیادہ پڑھیں، اس لیے ان کا اثر زیادہ ہے۔ اردو انشاء اور نثر نگاری میں شاید سب سے زیادہ اوراولین اثر خود اپنے والد صاحب کا پڑا، خصوصاً ان کی کتاب ''یادایام'' اور ''گلِ رعنا'' کا۔ دوسرے نمبر پر مولانا شبلی کا۔

نمبر۷-۸ کے جوابات بھی میرے مذکورہ بالا مضمون سے مل سکتے ہیں۔

نمبر۹- اردو رسائل کے خاص نمبر نہ تو بہت زیادہ دیکھے اور نہ اس وقت ذہن میں محفوظ ہیں، لیکن اپنے ذوق اور حالات کے لحاظ سے ''الفرقان'' کا ''مجدد نمبر'' اور ''شاہ ولی اللہ نمبر'' زیادہ دلچسپی سے پڑھے۔

نمبر۱۰- وہ کتابیں جن کا پڑھنا بڑا مجاہدہ ہے اور شدید ضرورت کے بغیر ان کے چند صفحات کا پڑھنا بھی میرے لیے دشوار ہے، وہ تین طرح کی چیزیں ہیں۔ ایک مناظرہ اور تردید کی کتابیں، دوسرے خشک فلسفیانہ مباحث یا وحدۃ الوجود وغیرہ، اور فلسفۂ اخلاق کی متصوفانہ کتابیں، تیسرے قادیانی لٹریچر جو حسنِ انشاء، حلاوتِ تحریر اور عمقِ فکر سے یکسر خالی ہے۔

نمبر۱۱- چوں کہ میری تحریر وتصنیف کا وقت صبح کو نماز فجر اور چائے کے بعد سے لے کر موسم گرما میں اس وقت تک کہ گرمی شدید نہ ہو اور موسم سرما میں ظہر کے قریب تک محدود ہے۔

اس کے علاوہ سالہا سال سے کسی دوسرے وقت میں تصنیفی کام نہیں کیا کرتا، اس لیے پڑھنے کا وقت ظہر سے عصر تک اور سفروں میں تقریباً دن بھر (کھانے اور آرام کرنے کے علاوہ)۔ رات کا پڑھنا نظر کی کمزوری کی وجہ سے تقریباً بیس پچیس سال سے بالکل بند ہے سوائے اس زمانہ کے جس میں دارالعلوم کے اندر حدیث کا کوئی درس اپنے ذمے لے لیتا تھا، اس کے لیے بہت مطالعہ کی ضرورت ہوتی تھی۔ لکھنے کا کام نہیں ہوتا یا لکھنے کے لیے مطالعہ کی ضروت ہوتی ہے تو فجر وظہر کے درمیان کا وقت بھی مطالعہ ہی میں صرف ہو جاتا ہے۔

میں میز کرسی پر یا ڈسک پر لکھنے کا کبھی عادی نہیں رہا۔ عام طور پر اس طرح لکھتا ہوں جس طرح آپ نے کاپی نویسوں کو لکھتے دیکھا ہوگا۔

رفتار مطالعہ عام طور پر ست ہے، طبیعت رواروی کے ساتھ پڑھنے پر قانع نہیں ہوتی، لیکن اس کا زیادہ تر انحصار موضوع اور مضمون کی نوعیت پر ہے، ادبی اور تاریخی چیزیں تیز رفتاری سے پڑھتا ہوں اور علمی مباحث آہستہ رفتاری اور دقت نظر کے ساتھ۔

نمبر۱۲- عام طور پر شور وشغب اور لوگوں کی موجودگی سے میرے مطالعہ میں اور بعض اوقات لکھنے میں بھی کوئی خلل نہیں پڑتا، اور شاید بعض لوگوں کے لیے یہ بات موجب تعجب ہو کہ بعض اوقات اس سے مدد ملتی ہے۔ میں نے اپنے بعض اہم مضامین اور کتابیں تھرڈ کلاس کے مسافروں سے بھرے ہوئے ڈبے میں لکھی ہیں۔ جب طبیعت میں روانی پیدا ہو جاتی ہے اور اپنے اندر لکھنے کا تقاضا اور مضامین و خیالات کی چیونٹیاں رینگتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں تو شور و ہنگامہ اس میں مخل نہیں ہوتا، لیکن جب ایسی کیفیت نہ ہو اور طبیعت بند و کند معلوم ہوتی ہو تو تنہائی اور خاموشی کی تلاش ہوتی ہے۔

نمبر۱۳- جب سے زمانہ قیام اور حضر کی مشغولیتیں اور ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں، کسی نئی کتاب کے مطالعہ کا زیادہ تر موقع سفر ہی میں ملتا ہے جو بکثرت پیش آتے ہیں، اور اس لحاظ سے

سفر بڑے مفید ثابت ہوتے ہیں۔ صدہا صفحات کی کتابیں اکثر سفر ہی میں ختم ہوتی ہیں۔

نمبر۱۴- کتابوں پر نشان لگانے کی عادت بہت پرانی ہے اور یہ میں نے اپنے استاد اور بزرگ مولانا سید طلحہ صاحب ایم-اے، سابق استاد اورینٹل کالج - لاہور سے سیکھی ہے، لیکن نشان بڑی احتیاط سے سرخ پنسل سے لگاتا ہوں۔ اگر گاڑی کی رفتار زیادہ تیز ہوتی ہے تو اس کے ٹھہرنے کا انتظار کرتا ہوں تاکہ نشان کتاب میں بدنمائی نہ پیدا کرے، حاشیے پر اپنی رائے بہت خوش خط لکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بعض اوقات ناواقف کو ایسے حواشی چھپے ہوئے نظر آتے ہیں، ان نشانوں اور حواشی سے کتاب کے دوبارہ پڑھنے میں مدد ملتی ہے اور اس کے بہترین حصے تصویر کی طرح سامنے آجاتے ہیں۔

نمبر۱۵- میرا حافظہ خاندانی طور پر کمزور ہے، لیکن اپنے ذوقی مضامین میں حافظہ زیادہ رفاقت اور رواداری کا ثبوت دیتا ہے۔ غیر ذوقی مضامین میں اس سے بہت کم۔ میرے خیال میں حافظہ کا بہت کچھ تعلق ذوق وپسندیدگی سے بھی ہے۔

نمبر۱۶- اپنی پسندیدہ چیزوں میں ہم نشینوں اور عزیزوں کو شریک کرنا ایک فطری امر ہے اور شاید یہ بات میرے اندر بہت سے لوگوں سے بڑھی ہوئی ہوگی۔ مجھے اپنے بزرگوں کی اس عادت سے خود بھی فائدہ پہنچا اور میں سمجھتا ہوں کہ میرے عزیزوں اور اہل مجلس کے لیے بھی یہ بات اسی قدر مفید ہوگی۔

نمبر۱۷- ہم دونوں بھائیوں کو ایک بڑا وسیع اور متنوع کتب خانہ وراثت میں ملا جو کئی پشتوں اور ایک علمی خاندان کا اندوختہ اور ترکہ ہے، لیکن اس کی موجودگی میں بھی مجھے اپنے ذوق وضرورت کی کتابیں خریدنے کا شوق بچپن سے ہے اور اس سلسلے کے بچپن کے واقعات کسی حد تک مضحک اور کسی حد تک سبق آموز ہیں۔ اس شوق کا آغاز اس عمر سے ہوگیا تھا جس عمر میں عام طور پر بچوں کو کھلونوں اور مٹھائیوں کے خریدنے کا شوق ہوا کرتا ہے۔ ذوق اور ثقاہت کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ اس شوق میں بھی اصلاح وترقی ہوتی

گئی، چنانچہ خود اپنی خریدی ہوئی اور مصر و شام سے منگوائی ہوئی کتابوں کا بھی ایک ذخیرہ جمع ہو گیا ہے، جو اگرچہ زیادہ وسیع نہیں ہے، مگر منتخب ہے۔ اس میں زیادہ تر وہ کتابیں ہیں جن کی حیثیت کسی موضوع پر چھوٹے سے دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) کی ہے اور جو اپنے موضوع پر خود ایک چھوٹے سے کتب خانے کا کام دیتی ہے۔

چوں کہ شروع سے عربی ادب وانشاء کا ذوق ہے، اس لیے ان میں وہ کتابیں بھی شامل ہیں جن کی کوئی علمی وفکری اہمیت نہیں ہے، مگر ان کے پڑھنے سے طبیعت میں شگفتگی اور لکھنے میں روانی پیدا ہوتی ہے، مثلاً ''اغانی'' کا خلاصہ اور ادباء کے مضامین کے مجموعے۔ اس منتخب ذخیرے میں ''دیوان غالب''، ''مثنوی'' کی کلید ''مرآۃ المثنوی''، کلام اقبال اور ''گلستان''، ''بوستان'' بھی ہے۔

بعض دفعہ مصر و شام کی کسی نئی چھپی ہوئی کتاب کے حصول کے لیے اپنے عزیزوں اور دوستوں کو لکھنا پڑتا ہے، وہ بھیجتے ہیں۔ بعض اوقات ایک کتاب جس کی قیمت آٹھ دس روپے سے زیادہ نہیں، کسی تصنیف کے سلسلہ میں ہوائی ڈاک سے منگوائی اور وہ پچاس ساٹھ روپے میں پڑی۔

اسلامی الفکر عرب مصنفین اکثر اپنی تصنیفات از راہ کرم ہدیۃً بھیجتے ہیں۔ اکثر سفروں میں علمی ہدایا مصنفین کے دستخطوں سے مزین ہو کر ملے ہیں جو اس ذاتی کتب خانہ کی زینت ہیں۔

نمبر ۱۸- کتابیں مستعار دینے کے سلسلے میں بڑے تلخ تجربے ہوئے۔ اس سلسلے میں اچھے اچھے اہل علم کی بے احتیاطی مشہور و معلوم ہے۔ بعض مرتبہ مستعار لینے والے اپنی ذمے داری محسوس نہیں کرتے اور مستعار دینے والا بھول جاتا ہے کہ کتاب کس کو دی تھی۔ میرے ساتھ یہ المیہ بہت پیش آیا ہے۔ اس سے کمتر المیہ یہ ہے کہ مستعار لینے والے کتاب بے احتیاطی کے ساتھ پڑھتے ہیں، کتاب پر دھبے اور نشانات پڑ جاتے ہیں اور بعض

ستم ظریف اس پر اپنے حواشی اور تأثرات ثبت کر دیتے ہیں اور کتاب جی سے اتر جاتی ہے۔ مجھے دو مرتبہ ایک کتاب سے اس لیے دست بردار ہونا پڑا کہ اس پر دھبے پڑ گئے تھے یا حواشی نے اس کی رونق و رعنائی ختم کر دی تھی۔ اس سلسلے میں یہ بھی عرض کر دوں کہ میں شروع سے کتاب کے بارے میں کچھ زیادہ نفاست پسند اور ذکی الحس واقع ہوا ہوں۔ کتاب پر پسینے کا ایک دھبہ یا کسی پڑھنے والے کی حاشیہ آرائی مجھے کتاب کے مطالعہ سے محروم کر دیتی ہے اور بعض اوقات مستعار لینے والے ہی کو نذر کر دیتا ہوں کہ اب میرے کام کی نہیں رہی۔

نمبر۱۹- میرے نزدیک ابتداء میں ادبی مطالعہ کی اہمیت بہت ہے۔ خوش قسمتی سے جن لوگوں کو ابتداء میں اچھی ادبی کتابوں کے مطالعہ کا موقع مل جاتا ہے اور ان کا ادبی ذوق کسی حد تک بن جاتا ہے، یا ان کے اندر ادبیت کے جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں، وہ خواہ فلسفہ کا موضوع اختیار کریں یا دینیات کا میدان، ان کی تحریر میں شگفتگی اور شیرینی باقی رہتی ہے اور وہ زیادہ کامیاب مصنف ثابت ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک ہر مرحلے میں کسی نہ کسی قدر ادبی مطالعے کا عنصر شامل رہنا چاہیے۔

نمبر۲۱- ادبی مطالعہ اور تحریروں کی مشق کے لیے اس وقت نوجوانوں کو مولانا شبلی، مولانا حالی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا آزاد، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عبدالماجد دریابادی، ڈاکٹر سید عابد حسین، چودھری غلام رسول مہر، مولانا شاہ معین الدین ندوی کی کتابوں اور تحریروں کو ضرور دیکھنا چاہیے۔ اس سے زیادہ ادبی ذوق اور زبان سے واقفیت پیدا کرنے کا شوق ہو تو پھر کچھ تحدید نہیں۔ مولوی محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد اور خالص ادیبوں کو بھی پڑھنا ہوگا۔ یہ نام تحریر کی پختگی، شگفتگی اور زبان کی صحت کے لحاظ سے پیش کیے گئے ہیں۔ کسی کے مخصوص خیالات وافکار سے یہاں بحث نہیں۔

نمبر۲۲- محض تفریحی ادب کے مطالعہ سے ذہن میں سطحیت، علم اور فکر میں بے مغزی اور

معلومات میں تہی مائیگی پیدا ہوتی ہے اور ایسا آدمی کوئی وقیع اور موثر کام نہیں کر سکتا۔ تفریحی ادب کا وہی حصہ ہونا چاہیے جو نمکیات وفواکہ کا ہوتا ہے، اور بعض اوقات اس سے کہیں زیادہ فلسفیانہ اور فکر انگیز مباحث کا مطالعہ بھی ذہن میں تحریک پیدا کرتا ہے اور اس کا کچھ نہ کچھ حصہ بھی شامل رہنا چاہیے۔

نمبر۲۳۔ اردو ڈائجسٹوں کا سلسلہ مفید اور ہمت افزائی کا مستحق ہے، لیکن ان میں مزید محنت اور حسن انتخاب کی ضرورت ہے۔ اردو کی اشاعت وترقی کے لیے یہ سلسلہ یقیناً مفید ثابت ہوگا۔ ان میں اگر ادبی عنصر کا اضافہ اور ادبی شخصیات اور کلاسیکی ادب کے تعارف کا سلسلہ بھی شروع کر دیا جائے اور وہ شوق انگیز اور مطالعہ کے لیے مہمیز ہو تو اس سے یہ خطرہ بھی باقی نہیں رہے گا کہ لوگ قدیم مستند ادب سے بے تعلق ہو جائیں گے۔

نمبر۲۴۔ اس سلسلہ میں دارالمصنفین، ندوۃ المصنفین، اسلامک پبلی کیشنز، اقبال اکیڈمی، شاہ ولی اللہ اکیڈمی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام جیسے اداروں کی مطبوعات کا مطالعہ مفید ہو گا۔ اس سلسلہ میں تواضع اور انکسار کو برطرف رکھ کر "تاریخ دعوت وعزیمت" کے سلسلے کے مطالعہ کا مشورہ بھی دوں گا۔

نمبر۲۵۔ میرے نزدیک ابتداء میں ناظرہ قرآن شریف پڑھنا بہت ضروری ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض ماہرین تعلیم کی رائے کے مطابق تھوڑی سی اردو پڑھا کر قرآن شریف کا پڑھانا زیادہ بہتر ہوگا یا عام دستور کے مطابق قرآن شریف ہی سے ابتداء کرانا زیادہ بہتر ہے۔ بہرحال مجھے اس رائے سے بالکل اتفاق نہیں ہے کہ سمجھ کر قرآن شریف پڑھنے کی استعداد پیدا ہونے کے انتظار میں ناظرہ پڑھانے کو بالکل موقوف رکھا جائے۔ ناظرہ قرآن شریف پڑھنا اور محض تلاوت خود ایک بڑی عبادت اور ایک امر مقصود ہے، سمجھ کر پڑھنا یہ ایک الگ کام اور ضرورت ہے۔ ان میں سے کوئی ایک دوسرے سے مستغنی نہیں ہے۔

حواشی

۱- ماہنامہ "الحق" (اکوڑہ خٹک)، مئی ۱۹۷۲ء، ص ۲۷

۲- خانوادہ حضرت شاہ علم اللہ رائے بریلوی، جس کے ایک فرد حضرت سید احمد شہید بانیٔ "تحریکِ اصلاح و جہاد" تھے۔

۳- یہ کتاب بڑی تقطیع پر "صمصام الاسلام" کے نام سے مطبع نولکشور-لکھنؤ کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔ بہت سے دیندار خاندانوں میں وہ بڑے ذوق وشوق سے پڑھی جاتی تھی (ابوالحسن علی)۔

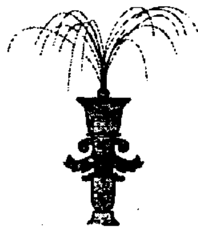
۴- یہ سفرنامہ پہلے ماہنامہ "معارف" (اعظم گڑھ) میں بالاقساط شائع ہوا، پھر انجمن ترقی اردو- دہلی، اور مکتبہ ندوۃ العلماء-لکھنؤ کی جانب سے "دہلی اور اس کے اطراف" کے نام سے چھپا۔

۵- یہ مجالس مکتبہ الفرقان-لکھنؤ کی طرف سے "صحبتے با اہل دل" کے نام سے شائع ہو چکی ہیں، اور اس وقت تک اس کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں (ابوالحسن علی)۔

۶- آپ حضرت شاہ پیر محمد صاحب سلونی چشتی نظامی کی اولاد میں سے تھے، زندگی گمنامی میں بسر کرنے کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریس حدیث کی خدمت قبول فرمائی اور کئی سال وہاں شیخ الحدیث رہنے کے بعد ۱۹۵۶ء میں انتقال کیا (ابوالحسن علی)۔

۷- --- اس کا ترجمہ مولوی شمس تبریز خاں کے قلم سے مجلس تحقیقات ونشریات اسلام-لکھنؤ نے "نقوش اقبال" کے نام سے شائع کیا ہے۔ (ابوالحسن علی)

۸- اِس کتاب کے زیرِ نظر حصے "میری علمی ومطالعاتی زندگی" کا آغاز اِسی مضمون سے کیا گیا ہے۔



سید رضوان علی ندوی

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ

—— سوانحی خاکہ ——

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی ایک عالمگیر شہرت کی شخصیت تھے، ہندوستان اور عالم عرب کی تو وہ گزشتہ پچیس تیس برسوں میں تنہا علمی و دینی نمائندہ شخصیت تھے۔ وہ ہندوستان یا برصغیر میں مولانا علی میاں یا صرف علی میاں اور عالم عرب میں شیخ ابوالحسن یا الشیخ الندوی کے نام سے مشہور تھے۔ (نام کے آخر میں ''میاں'' کا لفظ ہندوستان میں سیدوں کے نام بعد لگایا جاتا ہے اور کنیت عرب ممالک میں احتراماً استعمال ہوتی ہے)۔ حجاز مقدس کے اہل علم و معرفت مولانا مرحوم کو بجا طور پر برکۃ العصر (اپنے زمانے کی برکت) کے لقب سے یاد کرتے تھے۔

مولانا مرحوم کا امتیازی وصف، وسیع العلم اور کثیر التصانیف ہونے کے ساتھ، اسلام اور ملت اسلامیہ کے لیے اُن کا سوزِ دروں اور ان کی للّٰہیت و انابت الی اللہ تھی۔ مولانا مرحوم کے علمی شغف، کثرتِ مطالعہ، لاتعداد تصانیف، تواضع و انکسار، سادگی و بلند حوصلگی، زہد و استغناء عن الخلق، عزیمت و ہمت، قوتِ ایمانی، ہمہ وقت کی فکری و عملی سرگرمی اور سب سے بڑھ کر تعلق مع اللہ اور دعوتِ اسلامی کے لیے ان کی بے قراری اور تڑپ کو یاد کرتا ہوں تو ان کی رحلت پر مجھے جگر مراد آبادی مرحوم کا آخری زمانے کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

اور غالب کی زبان میں: